

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خونچکاں
ہر چند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوئے

۱۳-۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء
قیمت: ۵۰ پیسے
ہوائی ڈاک سے ایک روپیہ

ANWAR

پنجاب میں سیلاب کی تباہ کاریاں

۲½ ارب روپے کا نقصان

۸۰ لاکھ افراد متاثر

حالیہ ہولناک سیلاب نے پاکستان کے قلب اور طاقت کے قلعے پنجاب کو اقتصادی طور پر مفلوج کر دیا۔ سب سے زیادہ نقصان اسی صوبے کو پہنچا۔ نقصانات کی مکمل تفصیلات تو سیلابی پانی اترنے کے بعد ہی معلوم ہوں گی۔ جب ہی معلوم ہوگا کہ جہلم، چناب اور راوی کی طوفانی لہروں نے کتنے گھروں کے چراغ گل کر دیئے، کتنے جیالوں اور محنت کشوں کو ننگی لیاد کتنے کھیت، کھلیان ویران کر دیئے۔

حکومت کے حالیہ ابتدائی جائزے کے مطابق پنجاب کا مجموعی نقصان ڈھائی ارب روپے کے لگ بھگ ہے۔ سب سے زیادہ نقصان زرعی شعبے کو پہنچا۔ جو تقریباً دو ارب ۷ ہ کروڑ روپے ہے۔ نہروں کے نظام کا نقصان ۵ کروڑ ۲۰ لاکھ روپے ہے جس میں پنجند ہیڈ ورکس کا نقصان شامل ہیں پنجاب کے نقصانات کی تفصیل یہ ہے۔

کل اراضی جو سیلاب کی زد میں آئی ۔ ایک کروڑ ایکڑ
زیر کاشت رقبہ جو مکمل طور پر تباہ ہو گیا ۔ ۱۹ لاکھ ایکڑ
زیر کاشت رقبہ جسے جزوی نقصان پہنچا ۔ ۱۶ لاکھ ایکڑ
متاثرہ دیہات ۔ ۱۰ ہزار
مکانات تباہ ۔ ۵ ہزار
متاثرہ افراد ۔ ۸۰ لاکھ

صنعتی اداروں کا اندازاً نقصان ۔ ۲ کروڑ ۳۰ لاکھ روپے
صنعتی اداروں کا تیار شدہ مال جو ضائع ہو گیا ۔ ۱ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے
۱۹ لاکھ ایکڑ زیر کاشت رقبہ جو مکمل طور پر تباہ ہو گیا اس میں مندرجہ ذیل اجناس کاشت کی ہوئی تھیں۔

چاول ۔ ۲ لاکھ ۴۹ ہزار ایکڑ
کپاس ۔ ۷ لاکھ ۵ ہزار ایکڑ
مکئی ۔ ۷۹ ہزار ایکڑ
گنا ۔ ۹۰ ہزار ایکڑ
چارہ ۔ ۵ لاکھ ۳۰ ہزار ایکڑ

ضلع سیالکوٹ کے دیہات سب سے زیادہ متاثر ہوئے۔ اس ضلع کے متاثرہ دیہاتوں کی تعداد ۱۱۰۸ ہے۔ ہیرا رانجھے کے ضلع جھنگ میں ۷۲۰ دیہات سیلاب کی زد میں آئے۔ لیکن اس ضلع میں سب سے زیادہ اراضی کو نقصان پہنچا۔ یہاں ۱۴ لاکھ، ۷۶ ہزار، ۳۱۷ ایکڑ اراضی متاثر ہوئی۔

ضلع لاہور کی انتظامیہ نے سیلاب کے نقصانات کا اندازہ لگانے کے لئے ضلع لاہور کو تین سیکٹروں میں تقسیم کیا تھا۔ یہ سروے مکمل ہو گیا۔ ضلعی انتظامیہ کے ایک ترجمان نے نقصانات کی تفصیل یہ بتائی۔

ضلع لاہور کے متاثرہ دیہات ۔ ۲۱۲
اراضی جو تباہ ہو گئی ۔ ایک لاکھ ۶۹ ہزار ۲ سو ایکڑ
کاشت شدہ رقبہ ۔ ۶۶ ہزار ۷ سو ۱۴ ایکڑ
متاثرہ مکانات ۔ ۸۹۹۳
متاثرہ افراد ۔ ۱۳۷۲۰۰
مویشی جو بہہ گئے ۔ ۲۰۰

الیکٹرک سٹی لاہور ریجن کی رپورٹ کے مطابق لاہور ریجن کے سیلاب زدہ علاقوں میں تقریباً ۵ ہزار ٹیوب ویل لگے ہوئے تھے جن میں سے ۳۵۰۰ ٹیوب ویل سیلاب کی زد میں آئے۔ ان میں سے ۵۰ فیصد سے زیادہ ٹیوب ویلوں کی عمارتیں، موٹریں اور بنیادیں سیلاب کے ریلے میں تباہ ہو گئیں، اور اس قابل نہیں کہ انہیں استعمال کیا جا سکے۔

وفاقی وزیر خزانہ اور فلڈ کنٹرول کمیٹی کے چیئرمین ڈاکٹر مبشر حسن نے ۵ ستمبر کو بتایا کہ آبپاشی کے نظام کو سخت نقصان پہنچا۔ مظفر گڑھ نہر جو تونسہ سے نکلتی ہے، سیلاب سے مکمل طور پر تباہ ہو گئی۔ عباسیہ نہر کو اتنا شدید نقصان پہنچا کہ اس کی مرمت کے لئے طویل مدت درکار ہو گی۔ شجاع آباد کینال ڈسٹری بیوٹری سسٹم بھی ناکارہ ہو گیا۔ خانکی قادر آباد، بلوکی اور پنجند ہیڈ ورکس کو بھی نقصان پہنچا جس سے بارہ نہریں بری طرح متاثر ہوئیں۔ ان میں سے ۹ نہروں کو مکمل طور پر بحال کر دیا گیا۔ پنجند نہر اور رنگ پور نہر جزوی طور پر بہہ رہی ہیں۔

پنجاب میں نقل وحمل اور مواصلات کے نقصان کا اندازہ ۴ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے اور سندھ میں ۱۲ کروڑ ۵۰ لاکھ روپے بتایا جاتا ہے۔ محکمہ ڈاک کے نقصان کا اندازہ ۴۸

باقی صفحہ ۳۱ پر



۱۳-۲۰ ستمبر ۱۹۷۳ء
قیمت : ــــ ۷۵ پیسے
ہوائی ڈاک سے : ایک روپیہ

مدیر
وہاب صدیقی

خدا کی بستی کے مظلوم
عوام کا ترجمان

ہفت روزہ
الفتح

جلد ۴ ــــ شمارہ ۱۸

خاص مضامین

سرورق : انور سمیع
عکاسی : گ بینگو
فون : ۴۱۲۲۷۴

اداریہ

آزادیٔ صحافت ہمارا موقف

اِن دنوں تین اخبارات حریت، جسارت اور مہران پر ایک ماہ کی پابندی کیخلاف ملک گیر سطح پر اخباری صنعت کے کارکنوں میں شدید غم و غصّے کا اظہار کیا جا رہا ہے۔ ۱۵ ستمبر کو ۲۴ گھنٹے کی علامتی ہڑتال کرنے کا اعلان بھی کیا گیا ہے۔ ادارہ الفتح کے کارکن بھی اس جدوجہد میں برابر کے شریک ہیں۔ اس حمایت کی دو وجوہ ہیں، ایک یہ کہ بغیر وجہ بتائے تین اخبارات پر بیک وقت پابندی آزادیٔ صحافت پر براہِ راست حملہ ہے۔ دوسرا یہ کہ حکومت کے اس اقدام سے سینکڑوں اخباری صنعت کے کارکن معاشی بحران سے دوچار ہو گئے ہیں۔

ان تینوں اخبارات کی پالیسی اور طرزِ صحافت سے ہمارے سمیت بہت سے دوسرے شہریوں کو اختلاف کرنے کا اتنا ہی اختیار ہے جتنا کہ ہمارے مخالفین یا ان کے حامیوں کو الفتح سے ہو سکتا ہے۔ جسارت نے متعدد بار اپنے اس حق کو استعمال کیا ہے۔ اور ہم نے بھی اپنے حق سے دستبرداری سے کام نہیں لیا۔ ان کے علاوہ حکومت کے مکمل زیرِ اثر ٹرسٹ کے اخبارات اور پیپلز پارٹی کے ترجمان اخبارات ہیں جو خالصتاً حکومت کے موقف کی ترجمانی کرتے ہیں اور حزبِ اختلاف کو آڑے ہاتھوں لیتے ہیں۔

یہ خود ستائی نہیں کہ الفتح کے علاوہ تمام جرائد و اخبارات جاگیردارانہ، سرمایہ دارانہ سامراجی نظام کے علمبردار ہیں۔ ان کے مالکان یا تو ملک کے بائیس خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔

ارشاد راؤ پبلشر نے حقی آفسٹ پریس لیاقت آباد سے چھپوا کر دفتر ہفت روزہ الفتح، ۷/۸ ڈی ۔ نرسری کمرشل ایریا پی ای سی ایچ ایس کراچی ۲۹ سے شائع کیا

یا پھر حکمران طبقے سے بلاواسطہ یا بالواسطہ تعلق رکھتے ہیں۔ انہیں عوام سے کوئی سروکار نہیں۔ مزدوروں پر گولیاں چلیں تو یہ خاموش، کسانوں کا لہو بہے تو یہ چپ۔ یہ اپنے طبقے کے وفادار اور مظلوم طبقے کے بدترین دشمن ہیں۔ ان کا مقصد یا تو زیادہ سے زیادہ اشتہارات وصول کرنا ہے یا پھر اپنے آقاؤں کے لئے اقتدار کی راہ ہموار کرنا ہے۔ ان اخبارات میں کام کرنے والے جو سوچتے ہیں، وہ لکھ نہیں سکتے بلکہ جو مالکان حکم دیتے ہیں، اُسی کے مطابق کاروبارِ صحافت پروان چڑھتا ہے۔

یہ حالات ہوں تو پھر آزادیٔ صحافت کے مطالبے کا مطلب یہ ہوگا کہ مالکان اخبارات کی وکالت کا فریضہ انجام دے رہے ہیں، مگر ہم اور ہماری اخباری برادری کے کارکنوں کا مؤقف یہ نہیں رہا، ہمارا مطالبہ یہ رہا ہے کہ ملک میں جمہوری اقدار کی نشوونما کے لئے ضروری ہے کہ اخبارات کو تنقید اور حق گوئی کا جائز حق دیا جائے۔ اس ضمن میں جو اخبارات ملکی قوانین کی خلاف ورزی کریں، ان پر عام قوانین کے تحت کھلی عدالتوں میں مقدمات چلائے جائیں۔ نہ یہ کہ حکومت مصنف کے فرائض بھی انجام دے اور وضاحت یا صفائی کے حق سے بھی محروم کر دے۔ حکومت کے اس حق کو تسلیم کرنے کا مطلب یہ ہوگا کہ وہ جب چاہے اور جسے چاہے بند کر دے، جس کی اجازت کوئی جمہوری معاشرہ نہیں دے سکتا۔

اخبارات میں کام کرنے والوں کا تعلق محروم طبقے سے ہے، لہٰذا ان کی تمام ہمدردیاں مظلوم عوام کے ساتھ رہی ہیں۔ انہوں نے مالکانِ اخبارات اور ان کے پالتو ایجنٹوں یا کسی سیاسی جماعت کے تنخواہ دار نام نہاد صحافیوں کی عوام دشمن پالیسیوں کی ہر محاذ پر مزاحمت کی ہے۔ اس عمل کے دوران بڑی قربانیاں دی ہیں، آمریت کے خلاف عظیم عوامی جدوجہد کے دوران صحافیوں کی خدمات ہماری تاریخ کا سنہرا باب ہے۔ اخبارات کی بندش سے نہ صرف یہ کارکن بے روزگار ہوتے ہیں بلکہ اس محاذ پر وہ اپنے محدود ذرائع میں رہتے ہوئے عوام کے لئے جو کچھ کر سکتے تھے، وہ اب نہیں کر سکتے اور اس صورتِ حال میں دوسرے اخبارات کے وجود کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے، ان میں **الفتح** بھی شامل ہے۔ جس کے پرنٹر کو اظہارِ وجوہ کا نوٹس مل چکا ہے۔

ہم حکومت سے مطالبہ کرتے ہیں کہ وہ ان تینوں اخبارات کو بحال کرے اور اگر ان کے خلاف کارروائی کرنے کی کوئی معقول وجوہ ہیں تو عدالتوں سے رجوع کیا جائے۔ کالے قوانین اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے اندھا دھند استعمال سے گریز کیا جائے۔

ان اخبارات کے ایڈیٹروں، پرنٹروں اور پبلشروں کو غیر مشروط طور پر رہا کیا جائے۔



احوال واقعی

منہاج برنا



کیا شاہ فیصل واقعی امریکہ کو تیل سپلائی کرنا بند کر دینگے؟

عرب عوام کا سب سے بڑا دشمن، امریکی سامراج

گذشتہ دنوں سعودی عرب کے شاہ فیصل کے اس بیان نے کہ اگر امریکہ نے اسرائیل کو امداد دینا بند نہ کی تو وہ اپنے ملک سے امریکہ کے لئے تیل کی سپلائی بند کر سکتے ہیں، مغربی ممالک میں خاصی کھلبلی مچادی ہے۔ شاہ فیصل کے اس بیان کے دوررس نتائج ہی کا یہ تقاضہ تھا کہ امریکہ کے صدر نکسن کو اس کے بعد اپنی اس نئی پالیسی کا اعلان کرنا پڑا، کہ امریکہ آئندہ پانچ سال کے اندر اپنی ایندھن کی ضروریات کے لئے سعودی عرب اور مشرقِ وسطیٰ کے تیل پر انحصار کرنا ترک کر دیگا اور تیل کے بجائے ایندھن کے دوسرے ذرائع کو ترقی دیگا جن میں ایٹمی اور شمسی ذرائع شامل ہیں۔

امریکہ آئندہ پانچ سال میں ایسا کر سکے گا یا نہیں، یا خود شاہ فیصل امریکہ سے اپنی دوستی اور "تعاون" کی پالیسی کو ترک کر کے امریکی سامراج کو اپنے تیل کی سپلائی بند کرنے کی جرأت کریں گے یا نہیں۔ ایسے سوالات ہیں جن کے جواب قیاس ہی ہو سکتے ہیں۔ لیکن ایک بات واضح ہے کہ مشرقِ وسطیٰ میں تیل کی سیاست میں اب پہلے سے زیادہ گہرائی اور گیرائی پیدا ہوتی جا رہی ہے۔

شاہ فیصل کی دھمکی دو وجوہ کی بناء پر قابلِ غور ہے۔ پہلی وجہ تو یہی ہے کہ یہ دھمکی (کتنی ہی کمزور کیوں نہ سہی) ایک ایسے بادشاہ کی طرف سے دی گئی ہے جو ایک عرصہ

تیل بند ہوا تو امریکہ کا سارا کاروبار ٹھپ ہو جائے گا

سے امریکہ کے اتحادی تصور کئے جاتے ہیں۔ جن کے اقتصادی اور فوجی روابط امریکہ سے بہت گہرے ہیں۔ اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس علاقہ کے ایک دوسرے بادشاہ یعنی شہنشاہ ایران گزشتہ کچھ عرصہ سے امریکہ، یورپ اور جاپان کو اپنے علاقے سے تیل کی مسلسل سپلائی کا یقین دلا رہے ہیں۔

یعنی ایک بادشاہ امریکہ کو دھمکی دیتا ہے کہ اگر اس نے اسرائیل کی امداد بند نہ کی تو وہ اس کے لئے تیل کی سپلائی بند کر سکتا ہے۔ لیکن دوسرے بادشاہ کی بنیادی حکمت عملی امریکہ اور یورپ کو تیل کی سپلائی برقرار رکھنا اور اس مقصد کے لئے اپنی فوجی طاقت کو بڑھانا ہے۔ اس حقیقت سے تو سبھی واقف ہیں کہ کوئی عرب ریاست اسرائیل کو تسلیم نہیں کرتی لیکن ایران نہ صرف اسرائیل کو تسلیم کرتا ہے بلکہ اس سے اس کے سفارتی تعلقات بھی ہیں۔ اور دوسرے متعدد روابط استوار ہیں۔

شاہ فیصل کی دھمکی پر امریکی حکومت، اخبارات ٹیلی ویژن اور ریڈیو سبھی نے اپنے ردِ عمل کا اظہار کیا ہے۔ امریکی حکومت کے ان افسران کا جو تیل کے کاروبار سے تعلق رکھتے ہیں، یہ خیال ہے کہ "شاہ فیصل کا حالیہ بیان محض کھوکھلی دھمکی نہیں، وہ اس پر عمل بھی کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایسا ہوا تو پورا امریکہ ٹھپ ہو سکتا ہے۔"

خود مغربی ماہرین کے اعداد و شمار کے مطابق سعودی عرب کے تیل کے کنویں مجموعی طور پر ۸۰ لاکھ بیرل تیل یومیہ پیدا کرتے ہیں، اور مغربی یورپ اور امریکہ کی تیل کی ضروریات جس تیزی سے بڑھ رہی ہیں ان کے پیش نظر ۱۹۸۰ء تک تیل کی پیداوار ۲ کروڑ بیرل یومیہ ہو جانی چاہیئے۔ اگر ایسا نہ ہوا تو انکے اندازے کے مطابق یورپ اور امریکہ "ایندھن" کے انتہائی شدید بحران سے دوچار ہو جائیگا۔

یعنی مسئلہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ یورپ اور امریکہ کو تیل کی ترسیل بدستور جاری رہے بلکہ سعودی عرب تیل کی پیداوار میں اضافہ کرے۔ اس کے لئے تیل کی کمپنیاں جو بیشتر امریکی سرمائے سے چل رہی ہیں، سعودی عرب پر زور ڈال رہی ہیں کہ وہ تیل کی پیداوار کے وسیع منصوبوں پر عمل درآمد کرے۔ لیکن شاہ فیصل کا کہنا ہے کہ وہ اسوقت تک تیل کی پیداوار میں اضافہ نہیں کر سکتے جب تک کہ ان کے ملک میں تیل سے حاصل ہونے والی کثیر آمدنی کو اقتصادی طور پر جذب کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہو جائے۔ یعنی اس کے لئے ضروری ہے کہ مغربی ممالک بالخصوص امریکہ سعودی عرب کو صنعتی طور پر ترقی یافتہ بنانے میں مدد دیں اور اس طرح بتدریج سعودی عرب میں یہ صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ آئندہ دس بیس سال میں ایک متبادل معیشت کو جنم



کرنل قذافی کی سامراجی تیل کی سیاست پر موثر ضرب کاری



دے سکے اور صرف تیل پر انحصار نہ کرے۔ ان کے نزدیک یہ اس لئے بھی ضروری ہے کہ ایک وقت ایسا آئے گا جب تیل کے کنوئیں کثرتِ استعمال کی وجہ سے سوکھنے شروع ہو جائیں گے۔ اس وقت اگر ملک صنعتی طور پر ترقی یافتہ نہ ہوا اور کوئی متبادل معیشت نہ موجود ہو تو یہ ایک بار پھر اسی طرح ریگستان بن جائے گا جیسا کہ بیسویں صدی کے آغاز سے پہلے تھا جب اس علاقے میں تیل دریافت نہیں ہوا تھا۔

اس تجزیے سے دو باتیں سامنے آتی ہیں۔ ایک تو وہ جو شاہ فیصل آج سے ایک سال پہلے تیل کو سیاست سے ملوث کرنے کے مخالف تھے۔ اب اس کی ضرورت محسوس کرتے ہیں کہ وہ تیل کو اپنے اقتصادی مقاصد کے ساتھ ساتھ سیاسی مقاصد کے لئے بھی استعمال کر سکیں۔ اور اس کی وجہ محض یہ نہیں کہ شاہ فیصل کی مکمل طور پر قلب ماہیت ہو گئی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ ان کا موجودہ رویہ کسی قدر قوم پرستانہ رجحان کا پتہ دیتا ہے، جو عرب نیشنلزم کا حصہ ہے۔ لیکن اس رجحان کی بنیادی وجہ عرب عوام اور بالخصوص محنت کش عرب عوام کا وہ شعور ہے جو گزشتہ چند سالوں میں پختہ ہوا ہے۔

عرب ممالک کی اکثریت اب اس حقیقت سے بخوبی واقف ہے کہ ان کا سب سے بڑا دشمن امریکی سامراج ہے جو صیہونیت کا سب سے بڑا محافظ و معاون ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ امریکی سامراج کی امداد و حمایت کے بغیر اسرائیل ایک دن بھی اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتا۔ ۱۹۶۷ کی اسرائیلی جارحیت کے بعد عرب عوام کے سامنے سوویت یونین کا موقع پرستانہ کردار بھی اچھی طرح بے نقاب ہو گیا ہے۔ اور وہ اب روز بروز فلسطینی مجاہدوں کے اس قول پر یقین کرنے لگے ہیں کہ "جو چیز طاقت کے بل پر قائم کی جائے وہ طاقت ہی سے ختم کی جا سکتی ہے۔"

گزشتہ دنوں سامراجی تیل کی سیاست پر بڑی مؤثر ضرب لیبیا کے صدر کرنل قذافی نے لگائی۔ انہوں نے تمام غیر ملکی تیل کی کمپنیوں کو قومیا لیا۔ قیاس یہ تھا کہ امریکہ یا مغربی یورپ کے ممالک اس پر شدید ردِ عمل کا اظہار کریں گے۔ کچھ اسی قسم کا ردِ عمل کا اظہار جو ایران میں اینگلو ایرانین آئل کمپنی کے قومیانے پر کیا گیا تھا لیکن سر دست ایسا نہ ہوا۔ اب پیرس، واشنگٹن اور لندن میں اندر اندر کچھ سکوت ہو رہی ہے۔ لیکن خیال یہی ہے کہ سامراجی سر دست خون کا گھونٹ پی کر رہ جائیں گے۔

تیل اور مشرقِ وسطیٰ کے سلسلے میں شاہ فیصل کی آئندہ حکمتِ عملی کے بارے میں ابھی کوئی قطعی فیصلہ صادر نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن ایک بات ظاہر ہے کہ شاہ ایران کی طرح شاہ فیصل پر بھی یہ حقیقت آشکار ہو چکی ہے کہ تیل میں بڑی طاقت پوشیدہ ہے وہ یہ جانتے ہیں کہ وہ تیل کی طاقت میں ایران سے کہیں آگے ہیں۔ شہنشاہ ایران کا منصوبہ ہے کہ وہ ۱۹۸۰ء تک اپنے ہاں تیل کی پیداوار ۸۰ لاکھ بیرل یومیہ تک کر لیں گے۔ جبکہ سعودی عرب ۸۰ لاکھ بیرل یومیہ آج کل پیدا کرتا ہے اور ۱۹۸۰ء تک وہ ۲ کروڑ بیرل تک پیدا کر سکتا ہے۔

لیکن اس ضمن میں اس پہلو کو فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ شاہ فیصل اسرائیل دشمن ہونے کے ساتھ ساتھ کٹر قسم کے کمیونسٹ دشمن بھی ہیں۔ وہ مشرقِ وسطیٰ میں ترقی پسند طاقتوں کے ابھرنے اور ترقی پسند خیالات کی ترویج کے مخالف ہیں۔ اور اس معاملہ میں سخت متشدد واقع ہوئے ہیں۔ پھر اس بات کو بھی فراموش نہیں کرنا چاہیئے کہ سعودی عرب میں امریکی فوجی اڈہ موجود ہے۔ ان کی فوج اور سرکاری دفاتر کے بیشتر افسر امریکہ کے تربیت یافتہ ہیں۔ امریکہ سعودی عرب کے تمام رازوں سے واقف ہے۔ لہٰذا یہ بات قیاس ہی کی جا سکتی ہے کہ آخر شاہ فیصل اپنے موجودہ رجحانات کے ساتھ کس حد تک امریکہ کی مخالفت کریں گے۔

امریکہ اور یورپ کی یہ دھمکی کہ وہ عرب ملکوں سے تیل خریدنا بند کر دیں گے اور اس عرب اقتصادیات کو بحران میں مبتلا کر دیں گے، سر دست مضحکہ خیز ہی قرار دی جا سکتی ہے۔ یہ دھمکی صرف اسی وقت مؤثر ہو سکتی ہے جب یورپ اور امریکہ تیل کا کوئی ارزاں بدل دریافت کر لیں۔ صدر نکسن نے اس کام کے لئے پانچ سال کی مدت رکھی ہے لیکن ظاہر ہے کہ نکسن کا یہ بیان امریکہ کی طاقت نہیں بلکہ کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔

دیکھیں شاہ فیصل اپنی دھمکی پر کس حد تک اور کیسے عمل کرتے ہیں۔



صدر نکسن نے آنے والے خطرات کے پیش نظر نئی پالیسی کا اعلان کر دیا

اجمل خٹک کا انٹرویو

دیوان بریندر ناتھ



اجمل خٹک نے کہا:-

چین، گلگت اور بلتستان پر قبضہ کرنا چاہتا ہے

نیشنل عوامی پارٹی کے جنرل سیکرٹری اجمل خٹک کابل میں خود اختیاری جلاوطنی کے دن بسر کر رہے ہیں۔ کابل میں مقیم ہیں۔ لیکن قوم کے غم میں دبلے ہو رہے ہیں۔ اس غم کو بھلانے کے لئے بیانات کی توپیں داغتے ہیں۔ غیر ملکی اخبار نویسوں کو انٹرویو دیتے ہیں۔ سیاسی مبصرین اور سیاسی رہنماؤں سے آف دی ریکارڈ طویل مذاکرات کرتے ہیں۔ بھارتی اور روسی سفیروں اور سردار داؤد سے ملاقاتیں کرتے ہیں۔ لیکن پاکستان آنے سے گریز کرتے ہیں۔ ساحل پہ کھڑے ہو کر طوفان کا نظارہ کرنا چاہتے ہیں۔ ان کے ہر بیان اور انٹرویو کی تان اس پر ٹوٹتی ہے کہ مسٹر بھٹو پاکستان کی سلامتی کے لئے سب سے بڑا خطرہ ہیں۔ بھارتی اخبارات ان کے بیانات اور انٹرویوز کو شہ سرخیوں کے ساتھ شائع کرتے ہیں۔ اور پشتو کے عظیم قومی شاعر خوشحال خان خٹک اور ان میں مماثلت پیدا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ گزشتہ دنوں مسٹر اجمل خٹک نے بھارتی صحافی دیوان بریندر ناتھ کو ایک انٹرویو دیا، جس میں انہوں نے حسب روایت نہ صرف مسٹر بھٹو کے خلاف زہر اگلا بلکہ پاکستان کے عظیم دوست عوامی جمہوریہ چین پر بھی الزامات لگائے۔ اس انٹرویو کے چند اقتباسات نذرِ قارئین ہیں۔ تاکہ وہ یہ جان سکیں کہ مسٹر اجمل خٹک کابل میں کس مقصد کیلئے قیام پذیر ہیں۔ (ادارہ)

۵۵ سالہ اجمل خٹک سے گفتگو کے دوران میرے ذہن میں اُن کے پیش رو عظیم قوم پرست پشتو شاعر خوشحال خان خٹک کا ہیولہ اُبھرا، جو تیس سال تک مغل شہنشاہ اورنگ زیب سے لڑتے رہے۔ مسٹر اجمل خٹک بھی پشتو کے عظیم شاعروں میں شمار کئے جاتے ہیں۔ وہ بلند قامت سیاسی شخصیت ہیں۔ جبر و تشدد اور آمریت کے خلاف لڑنے والے جانباز اور دلیر سپاہی بھی۔

مسٹر اجمل خٹک پاکستان سے خود اختیاری جلاوطنی کے بعد ان دنوں کابل میں اسی مکان میں قیام پذیر ہیں، جہاں باچا خان نے اپنی خود ساختہ جلاوطنی کے دن پورے کئے۔ مسٹر اجمل کا زیادہ وقت ملٹری سائنس، معاشرتی سائنس، آرٹ تاریخ، معاشیات اور بین الاقوامی سیاست کی کتابوں اور رسائل کے مطالعہ میں گزرتا ہے۔ البتہ بعض مبصرین نے ان سے "آف دی ریکارڈ" طویل انٹرویو لیے، مذاکرات اور تبادلہ خیال کیا۔

سوال: آپ مسٹر بھٹو کی موجودہ پوزیشن کا نیشنل عوامی پارٹی اور پاکستان کے دیگر سیاسی گروہوں سے تقابلی جائزہ کس طرح کریں گے۔؟

خٹک: مبصرین کی اکثریت پاکستان کے معاملات کے سلسلے میں عام غلطی یہ کرتی ہے۔ کہ وہ مسٹر بھٹو کو جمہوری لیڈر تسلیم کرتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ وہ ایک شاطر سیاست دان ہیں، لیکن انہیں جمہوریت پسند کہا جاتا ہے اور نہ ہی محب وطن۔ ہمارا اس بات پر یقین کامل ہے کہ وہ نہ صرف پاکستان میں جمہوریت کی اُمیدوں کے لئے

سب سے بڑا خطرہ ہیں بلکہ ملک کی علاقائی سلامتی اور تحفظ کے لئے بھی خطرہ ہیں۔ مسٹر بھٹو نے ہی جنرل یحییٰ کو بنگلہ دیش میں فوجی کارروائی پر آمادہ کیا۔۔۔۔ اب بلوچستان میں فوجی کارروائی کی جا رہی ہے۔ میں نے اکثر کہا ہے کہ ہم پاکستان کی علاقائی سلامتی اور تحفظ کو خطرے میں ڈالنے والا کوئی اقدام نہیں کرنا چاہتے لیکن مسٹر بھٹو ملک کے علاقائی اتحاد کو توڑنا چاہتے ہیں۔ صحیح وفاقی ڈھانچے کے ذریعے ہی پاکستان کو متحد اور زندہ رکھا جا سکتا ہے۔ لیکن مسٹر بھٹو کے نزدیک صحیح وفاقی ڈھانچے کا مطلب بلوچستان کے سادہ لوح قبائل کے قتل عام کی مہم اور سرحد کی جمہوری حکومت کی غیر قانونی برطرفی کے سلسلے میں اپنی صلاحیت اور اختیارات استعمال کرنا ہے۔ میں واضح طور پر کہہ چکا ہوں کہ ہم اپنی "آگ" کو قابو میں رکھنے کی پوری کوشش کریں گے۔ لیکن اگر بنگلہ دیش جیسے حالات نے خود کو دہرایا، جو کسی بھی لمحہ میں ہو سکتے ہیں تو اس کا ذمہ دار صرف ایک شخص، صدر پاکستان (جب یہ انٹرویو لیا گیا اس وقت مسٹر بھٹو صدر پاکستان تھے) ہوگا۔

سوال: پاکستان کے مختلف صوبوں میں مسٹر بھٹو کی پوزیشن کے بارے میں آپ کا کیا اندازہ ہے؟

خٹک: جہاں تک بلوچستان کا تعلق ہے، وہاں کی صورت حال سب کے سامنے ہے۔ پندرہ لاکھ کی آبادی کو کنٹرول کرنے کے لئے چھ ڈویژن فوج متعین کی گئی ہے۔ غیر ملکی ماہرین کی ایک بڑی تعداد، جن میں ایرانی اور امریکی بھی شامل ہیں، بلوچستان میں موجود ہے۔ بلوچستان میں بمباری تک کی گئی۔ سرحد میں پوزیشن اتنی خراب ہے کہ مسٹر بھٹو کو انتخابات کروانے کی جرأت تک نہیں ہوئی۔ سرحد میں صرف ایک ذیلی انتخاب میں انہیں کامیابی ہوئی۔ جہاں تک سندھ کا تعلق ہے، کراچی میں اردو بولنے والوں کی اکثریت ہے۔ مکمل طور پر ان پر عدم اعتماد کا اظہار کر دیا۔ اور خود مسٹر بھٹو نے کہا کہ "یہ ایک حقیقی بغاوت ہے"۔

پنجاب مسٹر بھٹو کی طاقت کا قلعہ سمجھا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ پنجاب پاکستان کا قلب بھی ہے۔ جب میں حال ہی میں لاہور گیا (کابل جانے سے پہلے) تو پنجابی دانشوروں اور با اثر افراد نے نیپ سے رابطہ قائم کیا اور اعلانیہ کہا کہ صرف ایک ہی شخص پاکستان کو بچا سکتا ہے اور وہ ہے خان عبدالولی خان۔

یہ بات حقائق پر مبنی ہے کہ مسٹر بھٹو کے دورِ اقتدار میں بلوچستان اور سرحد میں پاکستان سے علیحدگی کا خطرہ پیدا ہو گیا ہے اور اگر ایسا ہوا، جیسا کہ پاکستانی عوام اعلانیہ

> **پنجاب**
> **صرف سرحد پر**
> **اعتماد کر سکتا ہے!**

اس خطرناک امکان کے بارے میں کہہ رہے ہیں، تو سندھ بھی زیادہ دیر تک پاکستان کے ساتھ نہیں رہ سکتا۔

ان حالات میں صحیح، منطقی اور باعزت راستہ یہ ہے کہ مسٹر بھٹو سے نجات حاصل کی جائے، اور ہمارا یہ موقف تسلیم کیا جائے کہ صحیح وفاقی نظام ہی، جس میں زیادہ سے زیادہ خود مختاری ہو، پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کی ضمانت دے سکتا ہے۔ اس کے علاوہ اگر اس اتحاد کو کبھی خطرہ ہو، یا کم از کم فرضی امکانات موجود ہوں تو ایسی صورت میں پنجاب صرف سرحد پر ہی اعتماد کر سکتا ہے۔ مسٹر بھٹو پنجاب کے لئے ایک بوجھ بنتے جا رہے ہیں۔ پنجاب کے رہنما مثلاً سردار شوکت حیات، ائر مارشل اصغر خان اور دیگر لیڈر اس بات کو سمجھتے ہیں۔ اس لئے وہ مسٹر بھٹو پر پہلے سے کہیں زیادہ نکتہ چینی کرنے لگے ہیں۔

غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت

خٹک: ہمیں غیر ملکی طاقتوں کی مداخلت کو بھی مدِ نظر رکھنا چاہیئے۔ ایک اہم اور ناقابلِ نظر انداز حقیقت یہ ہے کہ بعض ممالک مثلاً امریکہ نے ماضی میں پاکستان میں پارلیمانی جمہوریت کو ختم کر کے فوجی آمریت مسلط کی۔ انہی غیر ملکی طاقتوں نے جنرل ایوب خان کو ایشیاء کے عظیم رہنما کی حیثیت سے پیش کرنے کی کوششیں کیں تاکہ بھارت غیر جانبدارانہ پالیسی ترک کر دے۔ ایک مرتبہ پھر یہی طاقتیں اس وقت جنرل یحییٰ خان کو برسرِ اقتدار لائیں جب پاکستان جمہوریت کی راہ پر گامزن تھا۔ انہوں نے اس جمہوری تحریک کا خاتمہ کر دیا۔۔۔۔ اب مسٹر بھٹو تیزی سے مقبولیت کھو رہے ہیں۔ اب یہی غیر ملکی طاقتیں جمہوریت دشمن افراد کو منظرِ عام پر لائیں گی۔

سوال: آپ کے مسائل کے بارے میں چین کا رویہ کیسا ہے؟

خٹک: چینیوں نے تمام ان لوگوں کو مایوس کر دیا، جو انہیں آزادی، جمہوریت اور عوامی حقوق کا چیمپین سمجھتے تھے۔ یہ سب جانتے ہیں کہ انہوں نے انتہائی رجعت پسند گروہوں سے نہ صرف تعاون کیا بلکہ عوام کی جمہوری امنگوں کے خلاف دائیں بازو کی تنظیموں کو انتہائی مالی امداد بھی دی۔ یہ اطلاعات بھی موجود ہیں کہ چین اور ایران آپس میں گٹھ جوڑ کرنے والے ہیں، اور ان کی پالیسیوں کا مقصد اسلام آباد کو خودکشی پر مائل کرنا ہے۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ایران سندھ اور بلوچستان کے حصوں پر نظریں جمائے ہوئے ہے۔ اور چین آزاد کشمیر میں گلگت اور بلتستان کے علاقوں پر قبضہ کرنے کے لئے بے قرار ہے۔

حقیقی وفاقی نظام ھی پاکستان کو متحد رکھ سکتا ھے

الفتح رپورٹ

باثر افراد نے کمپنی کے لاکھوں روپے کے واجبات کی ادائیگی سے انکار کر دیا

جنرل مینجر کو خوش کرنے کے لئے لاکھوں روپے خرچ کر دیئے گئے

انڈس گیس کمپنی



پردہ چاک

ایک ذہین طالب علم سے سوال کیا گیا کہ پاکستان کی دو مشہور چیزوں کا نام بتاؤ۔ اس نے بلا توقف جواب دیا۔ قائدِ اعظم کے اقوال اور بدعنوانیاں۔ استاد اس کے جواب پر خاصے چیں بجبیں ہوتے، لیکن دل ہی دل میں شاگرد کی استادی کے قائل ہو گئے۔ پاکستان میں جس کثرت سے قائدِ اعظم کے اقوال کی نمائش کی گئی اسی تیزی کے ساتھ ان کی روح کو پامال بھی کیا گیا۔ ہر قدم اور ہر سطح پر مختلف قسم کے اخلاقی جرائم اور بدعنوانیوں کو فروغ دیا گیا۔ پاکستان میں چمک دمک کا ایک جھوٹا اور مصنوعی معاشرہ تعمیر کیا گیا۔ اس معاشرے کے بیمار لوگ صرف ایک چیز کے تعاقب میں بھاگتے رہے کہ وہ کس طرح تھوڑے سے عرصہ میں زیادہ سے زیادہ دولت حاصل کر سکتے ہیں۔ اس طرح ہمارا پورا معاشرہ کار، کوٹھی اور بنک بیلنس کے پیچھے پیچھے بھاگتا ہوا نظر آتا ہے۔ دولت کی لامحدود خواہش سے سرکاری نیم سرکاری اور پرائیویٹ اداروں میں بدعنوانیاں پروان چڑھیں، تاجروں اور سرمایہ داروں نے لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم کیا اور محنت کرنے والے طبقے کی زندگی حرام کر دی گئی۔

الفتح اپنے ذرائع اور معلومات سے بیمار معاشرے کی جراحی کرتا رہتا ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہمارا معاشرہ لاعلاج ہے، پھر بھی مرض کی شدت میں تھوڑی بہت کمی کی خاطر ہم قلم چلاتے ہیں۔ اس بار ہمیں انڈس گیس کمپنی کے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوئی ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ہماری آواز صدا البصحرا ثابت ہوگی۔ پھر بھی ایمانداری سے ـــ انڈس گیس کمپنی میں جو کچھ ہو رہا ہے، قارئین کے سامنے رکھنا چاہتے ہیں اور یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ایک اہم قومی ادارے میں کس اعلیٰ پیمانے پر بدعنوانیاں جاری ہیں۔ اور قومی وسائل کو کس بری طرح ضائع کیا جا رہا ہے۔ اربابِ اقتدار کو اس جانب پہلی فرصت میں توجہ دینی چاہیئے، ورنہ بدعنوان افراد جو وزیروں اور مشیروں سے تعلقات کے زعم میں ہر چیز کو اپنے باپ کی جاگیر سمجھ بیٹھے ہیں، دونوں ہاتھوں سے لوٹ لیں گے۔

محکمہ کے قانون کے مطابق اگر صارفین گیس کا بل تین ماہ تک ادا نہ کریں تو ان کا کنکشن کاٹ دیا جاتا ہے۔ عام صارفین پر تو اس ضابطے کا فوری اطلاق ہوتا ہے، لیکن یہی ضابطہ بااثر لوگوں کے لئے مفلوج بن جاتا ہے۔ ایسے بے شمار وزراء، ایم۔ این۔ اے اور ایم۔ پی۔ اے موجود ہیں جنہوں نے برسوں سے گیس کے بلوں کی ادائیگی نہیں کی ہے۔ لیکن ان کا کنکشن کاٹا نہیں گیا۔ بلکہ اس واضح ہدایت کی خلاف ورزی کرتے ہوئے ان کی گیس کی سپلائی بحال کی گئی ہے۔ اگر کبھی کسی نے ہمت کر کے ٹیلیفون ہی سے بلوں کی ادائیگی کی درخواست کر ڈالی تو بس قیامت ٹوٹ پڑتی ہے۔ جواب دیا جاتا ہے، "تمہیں معلوم نہیں ہم کون ہیں۔ اگر آئندہ تم نے ایسی گستاخی کی تو مزا چکھا دیا جائے گا۔" غریب ملازم اپنی ملازمت جانے کے خوف سے تھر تھر کانپنے لگتا ہے، اور آئندہ کیلئے کان پکڑتا ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ بااثر افراد وزارت اور اعلیٰ منصب پر فائز ہونے کے بعد تمام قوانین اور پابندیوں سے مستثنیٰ قرار پا جاتے ہیں۔ اگر یہ لوگ مروجہ قوانین کی خلاف ورزی کریں گے تو کیا عام شہریوں سے پابندی کی توقع رکھی جا سکتی ہے۔؟

ٹنڈو الہ یار کی تحصیل نصر پور تک گیس کی پائپ لائن بچھائی گئی۔ محض اس لئے کہ وہاں انڈس گیس کے جنرل مینجر کا مکان ہے۔ کیا ہمارا ملک اس بات کا متحمل ہو سکتا ہے کہ محض ایک یا چند اعلیٰ عہدیداروں کے آرام و آسائش کے لئے اتنی کثیر رقم خرچ کر دی جائے۔ ہمارا خیال ہے کہ اس اسکیم پر جتنے روپے خرچ ہوں گے وہ کبھی واپس نہ آئیں گے۔

اسی طرح سولنگیا آباد میں ایک بااثر شخص مسٹر سولنگی کے مکان تک گیس پہنچانے کے لئے خاص طور پر لائن دی گئی۔ موصوف نے ایک سال کے بعد بلوں کی ادائیگی کی۔ ہم محکمہ کے حکام سے صرف ایک سوال کرنا چاہتے ہیں۔ کیا ملک کے قدرتی ذخائر اور وسائل کا حق استعمال صرف اور صرف اعلیٰ طبقہ کو پہنچتا ہے۔ کیا اس پر ہمارے غریب عوام کا کوئی حق نہیں ہے۔ ان حالات میں جبکہ مہنگائی سے شہری بری طرح پریشان ہیں، روزمرہ کی چیزیں بازار سے غائب ہوتی جا رہی ہیں اور بااثر افراد کو ہر قسم کی سہولتیں مہیا کی جا رہی ہیں۔ یقیناً اس میں اوپری سطح کی پالیسی کا دخل نہ ہوگا، لیکن نچلی سطح پر اس قسم کی جو بھی عوام دشمن پالیسیوں پر عمل درآمد ہوتا ہے اس کے عوام میں بڑے منفی اثرات مرتب ہوتے ہیں۔ ان کے اندر بے چینی اور بے اطمینانی کی لہریں شدت پکڑتی جاتی ہیں، جو کبھی حکومتِ وقت کو ایک شدید قسم کے سیاسی بحران سے دوچار کر سکتی ہیں۔

ٹھیک اسی طرح ایک صوبائی وزیر کی سفارش پر ٹنڈو آدم اور شہداد پور میں گیس کی لائن دی گئی۔ یہ لائن بھی حسبِ معمول عوام کی بجائے چند بااثر وڈیروں کی آسائش کے لئے مہیا کی گئی۔ محکمہ کے فنی ماہرین کا خیال ہے کہ ٹنڈو آدم اور شہداد پور میں سوئی گیس کی فراہمی پر جتنی رقم خرچ کی گئی ہے اس کی واپسی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس طرح انڈس گیس کمپنی کو لاکھوں روپے کا خسارہ برداشت کرنا ہوگا۔

انڈس گیس کمپنی میں ایک لاکھ روپے کے اخراجات

سے ٹیلیفون ایکس چینج قائم کرنے کا پروگرام تیار کیا گیا۔ اس کے لئے ائیرکنڈیشنڈ لایا گیا۔ لیکن اس کی تنصیب میں غیر معمولی تاخیر اور لاپرواہی کا مظاہرہ کیا گیا۔ کچھ دنوں کے بعد محکمہ کے ایک اعلیٰ افسر ائیرکنڈیشنڈ کو اٹھا کر اپنے گھر لے گئے۔

ایک افسر ٹیلیفون ایکس چینج کا ایئر کنڈیشنڈ اٹھا کر لے گئے

سکھر کے اسٹور میں ایک لاکھ روپے کا غبن ہوا۔

اسی طرح خیرپور کے اسٹور سے بھی لاکھوں روپے کا سامان خورد برد کر دیا گیا۔ ان وارداتوں کے متعلق کوئی چھان بین نہ کی گئی۔ اگر کی گئی تو آج تک یہ معلوم نہ ہو سکا کہ ان چوریوں کا ذمہ دار کون ہے۔ اور اس کے خلاف کیا کارروائی عمل میں لائی گئی۔

—— انڈس گیس کمپنی میں ایک سال کے دوران تقریباً ڈیڑھ سو افراد کو بھرتی کیا گیا۔ یہ ایک اچھی بات اس وقت ہوتی جب تقرریاں قابلیت اور صلاحیتوں کی بنیاد پر کی جاتیں۔ ان آسامیوں کے دروازے بلا امتیاز ہر شخص پر کھولے جاتے۔ لیکن اس معاملے میں بھی مروجہ اصولوں کو پامال کیا گیا۔ تمام تقرریاں سفارش اور رشوت کی بنیاد پر کی گئیں۔ حیرت اس بات پر ہے کہ سندھ کے ایک بااثر شخصیت کے کہنے پر بیک وقت چار افراد بھرتی کئے گئے۔ یہ صحیح ہے کہ ڈیڑھ سو افراد روزگار پر لگ گئے۔ لیکن اس کا تاریک پہلو یہ ہے کہ بے شمار بیروزگار نوجوان اپنے جائز حق سے محروم رہ گئے۔

انڈس گیس کمپنی کی مبینہ بدعنوانیوں کی تمام تر ذمہ داری حکومت پر نہیں ڈالی جا سکتی۔ لیکن اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا کہ اس قسم کی بدعنوانیوں کی حوصلہ افزائی سرکاری حلقوں کے کچھ بااثر افراد ضرور کرتے ہیں۔ اور اسی وجہ سے سرکاری یا نیم سرکاری محکموں کے بدعنوان افسران بلا خوف و خطر اپنی مذموم سرگرمیاں جاری رکھتے ہیں۔ ایسی مثالیں بھی ہمارے سامنے موجود ہیں کہ اگر کسی محکمہ کے بدعنوان افسر کی بدعنوانیوں کا راز کھل گیا تو کوئی نہ کوئی بااثر شخصیت کی ڈوری ہلانے پر معاملے کو وہیں دبا دیا گیا۔ یا معمولی سرزنش کر کے چھوڑ دیا گیا۔ ہمارے ملک کی سب سے بڑی بدقسمتی یہی رہی ہے کہ ہر شخص کم سے کم مدت میں زیادہ سے زیادہ دولت بٹورنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کے لئے وہ ناجائز ذرائع تلاش کرتا ہے۔ اس طرح پورا معاشرہ اخلاق سوز سرگرمیوں کی پوٹ بن گیا ہے۔

بدعنوان افسران کے ساتھ ایسے بااثر افراد کو بھی پکڑنا چاہیئے جو انہیں آلۂ کار بنا کر الو سیدھا کرتے ہیں۔ یقیناً یہ جان جوکھوں کا کام ہے۔ اور اس میں بہت سے ایسے چہرے بھی بے نقاب ہوں گے جن پر شرافت اور ایمانداری کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔

—— انڈس گیس کمپنی ایک قومی ادارہ ہے۔ اس سے عوام کو فائدہ پہنچنا چاہیئے۔ صرف ایک مخصوص طبقہ کے عیش و آرام کے لئے اس ادارہ کو وقف کر دینا قومی بددیانتی ہے۔

راہ بتانا

رضیہ فصیح احمد



اردو میں راہ بتانا ایسے معنوں میں مستعمل ہے، جس میں کوئی شریف آدمی دوسرے کے پھٹے میں ٹانگ نہ اڑانے کی نصیحت کرتا ہے یعنی جاؤ میاں اپنی راہ لو کیوں دوسرے کا راستہ کھوٹا کرتے ہو۔ شاعری میں اسے یوں کہا جاتا ہے۔ ع

نہ کر اٹھکیلیاں باد بہاری راہ لگ اپنی

راہ بتانے کا یہ کام اتنا آسان نہیں ہے، اس کے لئے آدمی کو برنارڈ شا کی حد تک منہ پھٹ ہونا چاہیئے۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص برنارڈ شا نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ دوسرے اس کے کاموں میں مداخلت کرتے رہتے ہیں اور وہ کچھ نہیں کر سکتا۔ اس مفہوم میں راہ بتانا تو واقعی مشکل کام ہے۔ لیکن ہمارے تجربے نے ہمیں بتایا ہے کہ سیدھا سادھا کسی جگہ کا راستہ بتانا بھی ایسا آسان کام نہیں۔

لاہور میں پیدا ہونے والوں کے لئے یہ بات ماننا شاید مشکل ہو کہ لاہور بھی کسی کے لئے اجنبی ہو سکتا ہے۔ مگر اصل بات یوں ہے کہ اب سے کچھ عرصہ پہلے تک ہم لاہور میں مشہورِ زمانہ جگہوں کے راستے پوچھتے پھرا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ جہانگیر کا مقبرہ دیکھنے کے بعد ہم نورجہاں کا مزار دیکھنے چلے تو ریلوے لائن پار کر کے ٹھہر گئے کہ اب کدھر سے جائیں۔ سامنے کچے مکان تھے، اس کے بعد گڑھوں میں کھجور کے جھنڈ اور اس کے آگے نورجہاں کا مزار دکھائی دے رہا تھا۔ ایک راہ گیر سے راستہ پوچھا اس نے ہماری کار کو نظر انداز کرتے ہوئے مکانوں کی طرف اشارہ کیا اور بے نیازی سے کہا "ادھوں لنگ جاؤ، اوسامنے مزار اے"۔ پھر آگے بڑھ گیا۔ اس نے سڑک چھوڑ پگڈنڈی بھی نہ دکھائی، بلکہ وہ راستہ جیسے انگریزی میں کوّے کی اڑان کہا جاتا ہے ظاہر ہے کوہ و صحرا اور وادیاں عبور کر کے جانا ہمارا منشا نہ تھا، چنانچہ ہم آگے بڑھے اور کئی بھلے آدمیوں کے گمراہ کن مشوروں سے فیض یاب ہوتے آخر منزلِ مقصود تک پہنچے۔

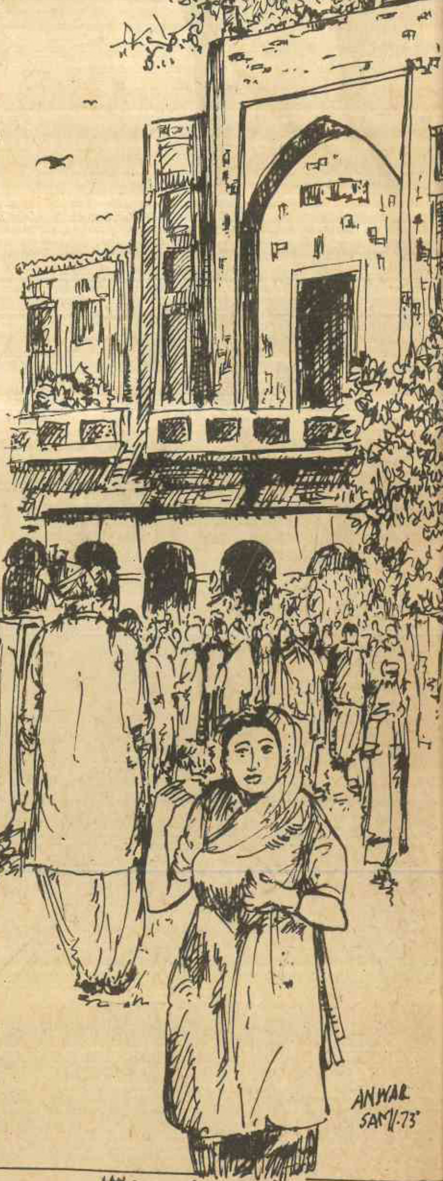
ایک دفعہ لاہور سے ملتان کی طرف باہر نکلنے کا راستہ پوچھ بیٹھے۔ راہ بتانے والے صاحب تو پورے خضر نکلے۔ پہلے تو وہ ہمارے ساتھ میلوں دور جانے کے لئے تیار ہو گئے۔ جب انہیں یقین دلایا کہ زبانی راستہ بھی ہم کبھی کبھار سمجھ لیتے تو وہ یوں گویا ہوئے "آپ اسی سڑک پر چلتے جایئے، چلتے جایئے آخر آپ چوبرجی پر نکلیں گے چوبرجی اصل میں ایک مغل عمارت کا دروازہ ہے۔ عمارت تو اب نہیں ہے، صرف دروازہ ہی رہ گیا ہے۔ خیال ہے کہ یا تو یہ —— عمارت بنی ہی نہیں یا پھر بعد میں تباہ ہو گئی۔ یہ چوبرجی بہت مشہور ہے اور بالکل سامنے ہے۔ آپ اسے فوراً پہچان جائیں گے۔ البتہ یہ ہے کہ اب اس کے صرف تین مینار ہیں۔ ایک گر چکا ہے پھر بھی یہ چوبرجی ہی کہلاتی ہے۔ اس پر نقاشی کا وہی کام ہے جو شاہی قلعے...."

"فرض کیا ہم چوبرجی پہنچ گئے، اب؟" ہمارے میاں نے بے صبری سے پوچھا۔

"اب کیا رہ گیا" خضر صاحب بُرا مان کر بولے، "بس اسی سڑک پر چلے جایئے یہی ملتان جاتی ہے"

"کیا آپ آثارِ قدیمہ میں رہبر کے فرائض انجام دیتے ہیں" میں نے جھانک کر ان صاحب سے پوچھا۔

"آپ نے کیسے جانا ــ؟" وہ حیران ہو کر میرا منہ تکنے لگے۔



افغانستان میں راستہ میلوں کی بجائے گھنٹوں میں بتایا جاتا ہے!

"میری بیوی علم نجوم میں کچھ شُدبُد رکھتی ہے۔" کہکر میاں نے جلدی سے گاڑی چلادی اور ان صاحب نے خاصے پیچھے رہ جانے کے بعد اپنا سر پیٹ لیا۔

راہ پوچھنے اور بتانے میں بعض اوقات لطیفے بھی ہو جاتے ہیں۔ ایک دن ہم نے ایک شریف صورت سے پوچھا "فیروز پور روڈ کدھر سے جائیں"۔ انہوں نے ہمیں گھورا اور آگے بڑھ گئے۔ ہمیں بڑا عجیب لگا۔ چند قدم آگے بڑھ کر پھر انہیں جالیا۔ ہمارے میاں نے ان سے کہا "صاحب اس میں ناراض ہونے کی تو کوئی بات نہیں، نہ فیروز پور روڈ کوئی گالی ہے، اگر آپ بتادیں گے تو کیا ہو جائے گا۔" ان صاحب نے جھنجھلا کر کہا "کسی اور سے پوچھیئے۔" اور پھر آگے بڑھ گئے۔ ہماری خودداری کو بڑی ٹھیس لگی، کچھ کرید بڑھی۔ میاں صبر کا دامن تھام کر پھر ان صاحب کے برابر پہنچے اور کہا "صاحب آپ سڑک کا پتہ ہمیں نہ بتایئے، یہ بتا دیجئے کہ اس میں بگڑنے کی کیا بات ہے۔" انہوں نے اور بھی بگڑ کر کہا۔ "فیروز پور روڈ پر کھڑے آپ فیروز پور روڈ کا پتہ پوچھ رہے ہیں، یہ بگڑنے کی بات نہیں تو اور کیا ہے۔"

ہمارے ملک کے ٹرایفک کانسٹیبل جو ہیں بیچارے مسافروں کی مدد پر اتنے ہی آمادہ رہتے ہیں جتنے کسی اور ملک کے سپاہی، مگر مجبوری یہ ہے کہ غریبوں نے خود کوئی جگہ نہیں دیکھی تو دوسروں کو کیا بتائیں۔ نہ ان کو ان فضول باتوں کا وقت نہ دماغ۔ اکثر جس سڑک پر خود کھڑے ہوں اُسی کا نام نہیں جانتے۔ اپنے دیس کی سردی گرمی اور انہیں بوکھلائے رکھتی ہے۔ سردی ہو تو ٹھنڈ میں سٹی گم۔ ایک مرتبہ گرمی کے موسم میں ہم نے ملتان میں قاسم باغ کا راستہ پوچھا۔ چوک کے سپاہی نے پسینہ ہاتھ سے پونچھ کر سڑک پر چھڑکتے ہوئے کہا "سیدھے جاکر دائیں بائیں مڑ جاؤ"۔ سیدھے تو ہم چلے گئے۔ مگر جب سڑک بٹی تو پتہ نہیں چلا کہ دائیں جائیں یا بائیں۔ پھر پوچھنا پڑا۔

کسی کا گھر تلاش کرنا ہو تو ہم عموماً شریف صورت آدمی دیکھتے تاکہ زبان و بیان کے ساتھ ہیبت و ابلاغ کا مسئلہ نہ اٹھ کھڑا ہو۔ خاصے انتظار کے بعد جب کوئی خضر صورت نظر آتے ہیں اور ہم ان سے رجوع کرتے ہیں تو وہ صاحب فرماتے ہیں "صاحب میں تو خود اس علاقے میں نیا ہوں" یا "میں تو خود فلاں صاحب کا گھر تلاش کر رہا ہوں، اگر آپ کو مل جائے تو مجھے بتا دیجئے۔" معلوم ہوتا ہے ہر علاقے میں شریف آدمی اجنبی ہی ہوتے ہیں۔ باقی سب اسی رنگ میں رنگ جاتے ہیں۔

سنتے ہیں کہ افغانستان میں راستہ میلوں کے بجائے گھنٹوں میں بتایا جاتا ہے۔ یعنی آپ پوچھئے فلاں جگہ کتنی دور ہے تو جواب ملے گا "دو ساعت"۔ ایک جاپانی پا پیادہ دنیا کے سفر پر نکلا ہوا تھا۔ شاید افغانستان جائے بغیر دنیا کا سفر مکمل نہ ہوتا ہو۔ چنانچہ وہ وہاں بھی چلا گیا۔ کسی جگہ کا راستہ پوچھا، اور کسی نہ کسی طرح دو ساعت کا

سپاہی نے کہا "سیدھے جاکر دائیں بائیں مڑ جاؤ"

مطلب سمجھ کر چل کھڑا ہوا۔ وہ مردِ خدا ساری رات چلا تب صبح دم منزلِ مقصود پر پہنچا۔ ساٹھ میل پیدل چلنا کسی جاپانی ہی کا کام ہے۔ بعد میں یہ بھی ہوا کہ اہل حکم نے اس کے کاغذات میں کوئی کمی نہ بتا کر اسے واپس بھیج دیا۔ اس وقت اس کے دل سے جو دعائیں نکلی ہوں گی ان کو الگ رکھئے مگر ان راستہ بتانے والوں سے کوئی پوچھے کہ "ساعت" میں فاصلہ بتانے سے پہلے سواری تو معلوم کر لیا کریں۔ مگر یہ راستہ بتانے والوں کا کام نہیں، نہ وہ اس پر مامور ہیں۔ نہ انہیں اس کی تنخواہ ملتی ہے، تو وہ کیوں خواہ مخواہ دردِ سر مول لیں۔

کچھ راستہ بتانے والے اس قدر کج بحث ہوتے ہیں کہ کچھ نہ پوچھیئے۔ ان سے سڑک پوچھئے تو کہتے ہیں کسی کے گھر جانا ہے۔ آدمی کا نام بتاؤ تو گھر کا نمبر یاد ہے۔ گھر کا نمبر بتاؤ تو پاس پڑوس کے پتے معلوم کرتے ہیں۔ اور آخر میں مسمسی سی شکل بنا کر کہتے ہیں "نہیں جی مجھے تو پتہ نہیں، آپ اُن صاحب سے پوچھ لیں"۔ پھر خود ان صاحب کو آواز دیتے ہیں۔ اس صدا پر ایک نہیں کئی آدمی ادھر لپکتے ہیں۔ اب تین چار آدمی بیک وقت راستہ سمجھاتے ہیں۔ ایک دائیں جانے کو کہتا ہے تو دوسرا بائیں۔ پھر وہ آپس میں لڑنا شروع کر دیتے ہیں، اور آپ رفع شر کے لئے بہتر سمجھتے ہیں کہ ان کو لڑتا چھوڑ کر آگے بڑھ جائیں، اور کہیں اور قسمت آزمائی کریں۔

ان باتوں سے گھبرا کر ایک وقت آیا کہ ہم نے شہروں کے نقشے اپنے پاس رکھنے شروع کر دیئے تو ایک نیا نقشہ بنا۔ جس موڑ پر گاڑی روک کر نقشہ کھولتے ہیں پیچھے گاڑیوں کا ہجوم غفیر لگ جاتا ہے۔ پولیس کانسٹیبل بھاگتا ہوا آتا ہے اور ہمیں راستہ بتانے میں اُلجھ جاتا ہے۔ گاڑیوں کی قطار اور لمبی ہو جاتی ہے کئی دفعہ فوجداری ہوتے ہوتے بچی۔ اب سڑک پر شہروں کے نقشے دیکھنے بھی چھوڑ دیئے ہیں، لوگوں سے راستہ پوچھنا بھی چھوڑ دیا ہے۔ خدا پر ایمان اور اپنے وجدان کے بھروسے راستہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔ بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک ہی سڑک پر بار بار نکل آتے ہیں، ایک ہی گھر کے سامنے سے بار بار گزرتے ہیں اور جب حالت پتلی ہو جاتی ہے تو اپنا اصول توڑ کر پھر کسی سے راستہ پوچھتے ہیں۔ تو پتہ چلتا ہے کہ جس گھر کو ہم تلاش کر رہے تھے وہ یہی ہے، جس کے سامنے سے بلا مبالغہ ہم بیس دفعہ گزر گئے ہیں۔

راستہ کھو جانے کی دریافت میں تازہ دریافت "ون وے" کا بھی خاصہ حصہ ہے۔ ایک جگہ کا سیدھا سادھا راستہ آپ کو معلوم تھا مگر اب وہ "ون وے" ہو چکا ہے۔ دوسرا راستہ ہوگا تو ضرور مگر آپ اسے ڈھونڈتے ہی رہیئے۔ کیونکہ وہ کہیں میلوں پرے نکلے گا۔ پھر کچھ جگہیں اتنی مشہور و معروف ہوتی ہیں کہ ان پر بورڈ لگانا ان کی بے عزتی سمجھا جاتا ہے۔ مثلاً "لاہور کا گورنمنٹ کالج یا دانتوں کا ہسپتال"۔ ان

مشہور عمارتوں پہ بورڈ لگانا ایسا ہی ہے جیسے ملک کے سربرآوردہ لوگوں کے کوٹوں پر ان کے نام لگا دینا۔ اب پردیسی لوگوں کے آرام کو دیکھیں، ان جگہوں کی ناموس کو۔

تجربے نے بتایا کہ راستہ ڈھونڈنے میں عموماً جو چیزیں معاون نہیں ہوتیں وہ یہ ہیں۔

نقشے ... نقشے یا تو بہت پرانے ہوتے ہیں جن میں "چیئرنگ کراس" کو "ملکہ کا بت" اور "باغِ جناح" کو "لارنس گارڈن" کہا جا رہا ہوتا ہے۔ یا اس قدر نئے ہوتے ہیں کہ بعض جگہوں کا نام صرف ان میں یا اخباروں میں بدلا جا چکا ہوتا ہے۔ عرف نام میں وہ پرانے ہی ناموں سے یاد کی جاتی ہیں۔ جیسے ساہیوال کو وہاں کے لوگ اب بھی منٹگمری ہی کہتے ہیں۔ لاہور کی مال اور پنڈی کی مری روڈ بھی اسی زمرے میں آتی ہے۔ آپ کسی سے شاہراہ محمد رضا شاہ پہلوی پوچھئے۔ اوّل تو وہ اتنی دیر ٹھہرے گا نہیں کہ آپ سڑک کا پورا نام لے سکیں۔ آخر وہ بے چارہ بھی گھر سے کسی کام ہی سے نکلا ہے۔ بالفرض اس نے سڑک کے برابر لمبا نام سن بھی لیا، لیکن اخبار نہ پڑھتا ہوا تو یہی کہے گا۔ "جناب یہ پاکستان ہے ایران نہیں۔"

بزرگ صورت افراد ... یہ لوگ راستہ سیدھی سڑک ہے اس پر کوئی کھٹکا نہیں کے اتنے قائل ہوتے ہیں کہ اینڈی بینڈی سڑکوں کے ناموں تک سے واقف نہیں ہوتے۔ اگر جوانی میں ہوں بھی تو اب تک تائب ہو چکے ہوتے ہیں۔ پھر ان کی روز افزوں دانائی اُن کی بینائی، سماعت اور حافظے پر کچھ ایسا ناخوشگوار اثر ڈالتی ہے کہ ان سے راستہ پوچھنا خطرے سے خالی نہیں۔

سڑکیں ... ان کم بختوں کو بلا نوٹس اِدھر اُدھر مڑ جانے کا ایسا شوق ہوتا ہے کہ مسافروں کو راستہ کھوجنے کی بجائے بھٹکانے میں مدد دیتی ہیں۔

پولیس کانسٹیبل ..... کہ وہ صرف اپنے گھروں کے راستے جانتے ہیں۔

ٹیکسی والے .... کہ محض ان جگہوں کی طویل ترین راہوں سے واقف ہوتے ہیں، جہاں آپ ان کی ٹیکسی میں بیٹھ کر جائیں۔



وہ دریا کا آتش فشاں پھٹ پڑا وہ موجوں کا لاوا اُمڈنے لگا
چڑھے اتنے دریا، سمندر بنے نگلنے کو انساں کے اژدر بنے
کناروں کے سینے پھٹنے لگے درختوں میں انساں اٹکنے لگے
وہ پانی کی تلوار چلنے لگی! غریبوں کی بستی اُجڑنے لگی
وہ دیہات سب زیرِ آب آگئے سروں پہ مہیب اَبرِ غم چھا گئے
وہ مٹی کے لاکھوں مکاں بہہ گئے وہ بچے، وہ پیر و جواں بہہ گئے
وہ شہروں کی گلیوں میں نہروں کا شور وہ ہر گھر میں مُنہ زور لہروں کا شور
درختوں پہ انساں ہیں سہمے ہوئے قریب ان کے ہیں سانپ لٹکے ہوئے
لہکتی ہوئی کھیتیاں بہہ گئیں زمیں پہ فقط دلدلیں رہ گئیں!
جدھر دیکھئے، موت ہے خندہ زن گھرا ہے بلاؤں میں سارا وطن
یہ مہنگائی، یہ بھوک، بیماریاں جلانے لگیں بن کے چنگاریاں

نہ چونکے جو اب بھی گراں خواب سے
نہ بچے گا نہ کوئی بھی سَیلاب سے

عبداللہ بلوچ

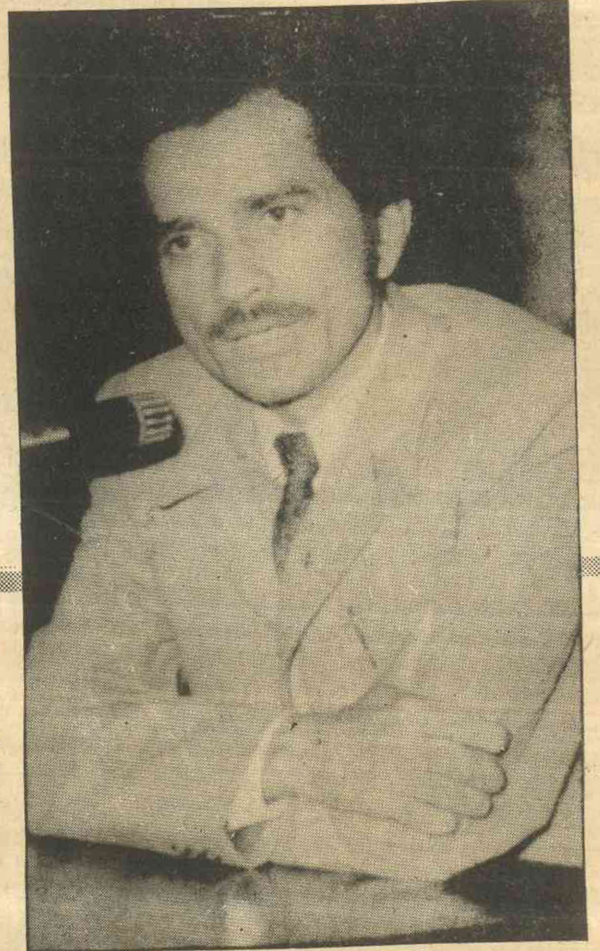
آج اور کل

فضل الٰہی

کچی گولیاں نہیں کھیلتا، میں اپنے لئے ایسی مضبوط اور پائیدار سیڑھی تلاش کروں گا جو مجھے زمین سے اٹھا کر یکدم آسمان پر پہنچا دے گی

معمولی کارکن کو قارون کا خزانہ کہاں سے ملا؟

پاک کالونی میں کھیل میدان انہیں الاٹ کر دیا گیا



انہوں نے کارکنوں میں دھڑے بندیاں کیں

پاکستان پیپلز پارٹی جب اپنے ابتدائی دور کی جان لیوا آزمائش سے گزر رہی تھی، اس وقت اس میں بھانت بھانت کی بولیاں بولنے والے موقع پرستوں کا اتنا کثیر جمگھٹا نہ تھا۔ ہر سطح پر ایماندار اور مخلص کارکن اپنا سر ہتھیلیوں پر لئے ہوئے پھرتے تھے۔ انہیں نام و نمود کی خواہش تھی نہ اقتدار کی ہوس۔ انہوں نے پارٹی کی تعمیر میں اپنا لہو دیا۔ اپنے روزگار، ملازمتوں یہاں تک کہ اپنے مستقبل کو داؤ پر لگا دیا۔ پابندِ سلاسل ہوئے اور پارٹی کی وفاداری کی سزا اپنی ننگی پیٹھوں پر کوڑے کھا کر برداشت کی۔ یہ ساری قربانیاں ذاتی فائدے کے لئے نہیں بلکہ استحصال سے پاک ایک نئے معاشرے کے قیام کے دعدے پر دی گئی تھیں۔

ان مخلص اور جری کارکنوں کے قافلے میں ابھی عبداللہ بلوچ جیسے لوگ شامل نہیں ہوئے تھے۔ لیکن ایسے لوگ بڑے غور سے جائزہ لے رہے تھے۔ وہ موقع کے انتظار میں تھے کہ مطلع صاف ہو جائے تو پھر وہ اپنا نام تو بڑا سنبھال کر پارٹی میں گھس جائیں۔

یادش بخیر ان دنوں عبداللہ بلوچ کے ای ایس سی میں کلرک کے "عہدہ جلیلہ" پر فائز تھے۔ دفتر کے قریب ہی ایک ایرانی ہوٹل میں گھنٹوں بیٹھ کر اپنے مستقبل کے متعلق پلان بنایا کرتے تھے۔ اکثر اپنے دوستوں سے کہتے "مجھے کلرک کا ذلیل پیشہ بالکل پسند نہیں۔ میں اپنی ترقی کا زینہ تلاش کر رہا ہوں۔ جس دن وہ ہاتھ آگیا، اس نوکری پر لعنت بھیج دوں گا۔" ان کے دوست اکثر و بیشتر چھیڑ خانی کرتے، "اگر ٹوٹی ہوئی سیڑھی ملی تو کیا کرو گے۔"

عبداللہ بلوچ بڑی معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ کہتے "میں کچی گولیاں نہیں کھیلتا۔ میں اپنے لئے ایسی مضبوط اور پائیدار سیڑھی تلاش کروں گا جو مجھے زمین سے اٹھا کر یکدم آسمان پر پہنچا دے گی۔"

انہی دنوں پیپلز پارٹی کی قیادت میں "ایوب شاہی" کے ظالمانہ دور کے خلاف عوامی تحریک زور پکڑ گئی۔ پیپلز پارٹی کے نعرے عوام میں روز بروز مقبول ہوتے گئے۔ عوام کے شہری استحصالی نظام کا خاتمہ چاہتے تھے۔ کپڑا اور مکان کی ضمانت چاہتے تھے جو انہیں قیا سے



اب تک نہیں ملی تھی۔ پیپلز پارٹی کا منشور گلی کوچے میں موضوعِ بحث بنا ہوا تھا۔ منشور ایک لفظ میں پاکستان کے مظلوم باشندوں کا حل دے رہا تھا۔ پیپلز پارٹی جس تیزی سے عوام میں مقبول ہو رہی تھی، اسی تیزی کے ساتھ اس کے مخلص کارکن ایوبی [illegible] کے زیرِ عتاب آتے جا رہے تھے۔ مختلف شہروں میں آئے دن پارٹی کے کارکنوں اور پولیس میں تصادم ہوئے۔ جیلیں کارکنوں سے بھر دی گئیں، پورے ملک کی فضا لاٹھی، گولی اور آنسو گیس کے شیل سے دھواں دھواں ہو گئی۔

عبداللہ بلوچ ان حالات کا بڑی گہری نظر سے جائزہ لیتے رہے تھے۔ وہ اس انتظار میں تھے کہ معاملہ کچھ ٹھنڈا ہو جائے تو وہ پیپلز پارٹی میں دھنس جائیں۔ چونکہ پارٹی ایک کٹھن آزمائش سے گزر رہی تھی۔ اس لئے اس میں شامل ہونا خطرناک تھا۔ بقول ان کے ایک دوست کے، موصوف ہمیشہ حلوہ ٹھنڈا کر کے کھانا پسند کرتے ہیں۔ لیکن اس دوران وہ خاموشی سے نہ بیٹھے، بلکہ چپکے چپکے پارٹی میں وہ زینہ تلاش کرتے رہے، جس کے سہارے انہیں منزل تک پہنچنا تھا۔

> **وہ متعدد سیاسی، نیم سرکاری اور خود مختار اداروں کے چیئرمین، ڈائریکٹر اور رکن ہیں!!**

ایک دن ایک صاحب (انہوں نے اپنا ظاہر کرنے سے منع کر دیا) کے ذریعہ ان کی جناب عبدالحفیظ پیرزادہ سے ملاقات ہو گئی۔ انہوں نے کمال ہوشیاری سے گفتگو کے دوران پیرزادہ صاحب کو شیشے میں اتار لیا۔ اور انہیں اس بات کا یقین دلایا کہ وہ پارٹی میں "رائٹ ونگ" کا کردار ادا کریں، اگر کبھی پارٹی کے لیفٹسٹوں سے محاذ آرائی کی نوبت پہنچی تو وہ نچلی سطح پر پیرزادہ صاحب کے خیالات کی ترجمانی کے فرائض ادا کریں گے۔ اور بائیں بازو کے کارکنوں کے گروپ میں توڑ پھوڑ کرائیں گے۔

ان دنوں پارٹی میں عبدالحفیظ پیرزادہ بھی نئے نئے داخل ہوئے تھے۔ اور معراج محمد خان کے مقابلے میں ان کا کچھ زیادہ اثر نہ تھا۔ وہ عموماً ایسے آدمیوں کی تلاش میں رہتے تھے جو کارکنوں میں ان کی ساکھ کو مضبوط اور مؤثر بناتے۔ پہلی ملاقات میں وہ عبداللہ بلوچ سے خاصے مطمئن نظر آتے تھے۔ اس کے بعد ان کے درمیان مزید تین چار ملاقاتیں ہوئیں۔ ہر ملاقات میں عبداللہ بلوچ نے یہ تاثر چھوڑا کہ وہ ان کی خدمات بہتر طور پر ادا کرنے کی صلاحیتیں رکھتے ہیں۔ چنانچہ پیرزادہ صاحب نے عبداللہ بلوچ کو اپنے دفتری کاموں کے لئے رکھ لیا اور ڈیڑھ سو روپے ماہانہ بھتہ باندھ دیا۔

جناب پیرزادہ نے ان پر ایک اور کرم کیا۔ ایک پرانی وضع کی موٹر سائیکل خرید کر انہیں دیدی۔ اس کے بعد پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے دیکھا کہ پیرزادہ صاحب جہاں جاتے وہ ان کا بیگ اٹھائے پیچھے پیچھے نظر آتے۔ ان کی حیثیت ذاتی ملازم جیسی تھی۔ انہوں نے پارٹی میں کام کرنا شروع نہیں کیا تھا۔ لیکن کارکنوں میں تبدریج اپنے لیے جگہ بنانے کی تگ و دو کر رہے تھے۔ یہ ان کے لئے سب سے مشکل کام تھا۔ کیونکہ مخلص کارکنوں میں صرف انہی لوگوں کی لائن تھی جو پارٹی اور اس کے منشور کے لئے آگے بڑھ کر کام کر رہے تھے اور قربانیاں دے رہے تھے۔ جب حالات کسی حد تک واقف ہوئے اور یہ محسوس ہونے لگا کہ پارٹی کی جڑیں عوام میں گہری ہو گئیں۔ اور آئندہ انتخابات میں اگر واضح اکثریت نہیں تو اچھی خاصی سیٹیں حاصل کرے گی تو موصوف نے پارٹی میں باقاعدہ شمولیت اختیار کر لی۔

عبداللہ بلوچ کے ای ایس سی کی کلرکی سے صوبائی اسمبلی کی ممبری تک

مزدوروں نے عبداللہ بلوچ کا گھیراؤ کرلیا

پارٹی میں ان کی خدمات کا اندازہ ایک واقعہ سے لگایا جاسکتا ہے۔ ویت نام میں امریکی بمباری کے خلاف پیپلز پارٹی کراچی کے کارکنوں نے ایک احتجاجی جلوس نکالا۔ موصوف بھی اس جلوس میں شامل تھے۔ جب یہ جلوس امریکی سفارت خانہ کے قریب پہنچا تو پولیس نے لاٹھی چارج کردی۔ صورتِ حال خاصی خراب ہوگئی۔ پولیس اور کارکنوں میں باقاعدہ تصادم ہوگیا۔ عبداللہ بلوچ نے دیکھا کہ حالات قابو سے باہر ہوگئے تو وہ اپنے کارکنوں کو پولیس کے نرغے میں چھوڑ کر سرپٹ بھاگ کھڑے ہوئے۔ تماشہ دیکھنے والوں کا کہنا ہے کہ موصوف اپنا جوتا بھی بطورِ نشانی اس جگہ چھوڑ گئے تھے۔

عبداللہ بلوچ پیپلز پارٹی میں نئے نئے داخل ہوتے تو پیرزادہ صاحب نے سب سے پہلے انہیں ناظم آباد کے دفتر میں آفس سیکرٹری بنوادیا۔ اس کے عوض انہیں پارٹی سے باقاعدہ تنخواہ بھی ملتی تھی۔ کچھ عرصہ بعد انہیں پیپلز پارٹی ناظم آباد کا جنرل سیکرٹری بنادیا گیا۔ یہ انتخاب بہت سوچ سمجھ کر کیا گیا تھا۔ اس علاقہ میں باشعور اور مخلص کارکنوں کا بڑا گہرا اثر تھا۔ جنہیں پارٹی میں بائیں بازو کا نام دیا جاتا تھا۔ عبداللہ بلوچ نے پارٹی میں گھستے ہی کارکنوں میں توڑ پھوڑ اور دھڑے بندی کا سلسلہ شروع کردیا۔ موصوف نے تھوڑی سی مدت میں کارکنوں کے اتحاد کا شیرازہ منتشر کردیا۔ اچھے اور محنتی کارکنوں کی اس قدر حوصلہ شکنی کی گئی کہ وہ خاموشی سے پارٹی سے علیٰحدہ ہوگئے۔ اس کے بعد عبداللہ بلوچ نے جی حضوریوں کا ایک گروپ تیار کیا اور اپنے مخصوص عزائم کی تکمیل میں جُٹ گئے۔

عبداللہ بلوچ ان دنوں پرانے گولیمار میں ایک جھگی نما کچے مکان میں رہتے تھے۔ در و دیوار پر حسرت و یاس کا رنگ چڑھا ہوا تھا۔ پیدل سفر کرتے تھے، گھنٹوں بس کا انتظار کرتے اور دوستوں سے قرض لے کر اپنا کام چلاتے تھے۔ دسمبر ۱۹۷۰ء کے عام انتخابات کے دوران پیرزادہ صاحب نے ان کی "خدمات" سے خوش ہوکر صوبائی اسمبلی کا ٹکٹ دلوادیا۔ پارٹی کے کارکنوں نے اس جانبداری کی شدید مخالفت کی، مگر پیرزادہ صاحب کے سامنے ان کی ایک نہ چلی۔ ان کے انتخابی مہم کے سارے اخراجات بھی خود برداشت کئے۔ اور ان کی انتخابی سرگرمیوں میں بھرپور حصہ لیا۔ اس طرح عبداللہ بلوچ ایک بار پھر پیرزادہ صاحب کی کرم فرمائی کی بدولت صوبائی اسمبلی کے رکن منتخب ہوگئے۔

پیپلز پارٹی کو اقتدار ملا تو عبداللہ بلوچ کے سارے دکھ درد دور ہوگئے۔ مئی ۷۲ء میں مل مالکان نے اچانک کارخانوں سے مزدوروں کی بڑی تعداد کو برطرف کرکے صنعتی امن تباہ کردیا۔ عبداللہ بلوچ نے اس موقع سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ اِدھر مزدوروں کو دلاسہ دیتے، اُدھر مل مالکان کو دھمکی دیتے۔ یہ پالیسی خاصی کامیاب رہی۔ پیداگیری کا بڑا موثر ذریعہ تھا۔ لیکن جب یہ معاملہ کچھ حد سے گزر گیا تو مزدوروں میں عبداللہ بلوچ کے خلاف سخت اشتعال پھیلا۔ ویلکا کے مزدوروں نے تنگ آکر ایک دن موصوف کا گھیراؤ کرلیا۔ اور انہیں دھمکی دی کہ اگر آئندہ سے وہ سائٹ کے علاقے میں دیکھے گئے تو ان کے ساتھ بہت بُرا سلوک کیا جائے گا۔

لسانی فسادات کے دوران ایک مشتعل ہجوم نے پاک کالونی میں ان کے مکان کو جلادیا۔ کبھی اس جگہ ان کا چھوٹا سا کچا مکان ہوا کرتا تھا۔ جہاں اب ایک اچھا خاصا پختہ مکان نمودار ہوگیا تھا۔ شرپسندوں نے مکان کو آگ لگادی اور بیشتر قیمتی سامان کو تباہ کردیا۔ صرف ایک کمرے کے پردوں کی مالیت ہزاروں روپے بتائی جاتی ہے۔ نقصانات کا اندازہ لاکھوں روپے لگایا گیا۔ شرپسندوں نے یقیناً یہ مذموم اور قابلِ نفرت حرکت کی تھی۔ لیکن عبداللہ بلوچ سے بھی ایک سوال کیا جاسکتا ہے کہ جناب آپ معمولی کارکن تھے اور وہ بھی ایک سوشلسٹ پارٹی کے۔ آپ کی معاشی حالت بہت خراب تھی، آخر اتنی مدت میں آپ کو یہ قارون کا خزانہ کہاں سے مل گیا۔؟ کیا قوم کو اس سوال کا جواب دیں گے۔؟

ہنگامہ ختم ہونے کے بعد پارٹی کے بڑے رہنماؤں نے ان کے سارے نقصانات پورے کردیئے۔ ہزاروں روپے نقد دیئے گئے۔ پاک کالونی میں کھیل کا میدان انہیں آلاٹ کردیا گیا۔ اس وقت پیپلز پارٹی حلقہ ۴ اور ۵ کے صدر ہیں۔ کراچی زون کے سینئر نائب صدر ہیں۔ صوبائی اسمبلی کے رکن ہیں، کے ڈی اے کی گورننگ باڈی کے ممبر ہیں۔ پیپلز ڈیولپمنٹ پروگرام میں سندھ بورڈ کے ممبر ہیں۔ کراچی ڈسٹرکٹ کوارڈینیشن کمیٹی کے چیئرمین ہیں۔ دیہی فشرمین کوآپریٹو سوسائٹی کے ڈائریکٹر۔ فوڈ کمیٹی کے ایک ڈویژن کے چیئرمین، ڈرمیسائل سرٹیفیکیٹ کی APPEALING COMMTTEE کے ممبر کے علاوہ اس قسم کی بے شمار کمیٹیوں کے ممبر اور چیئرمین ہیں جہاں سے معقول آمدنی کا مستقل سلسلہ جاری ہے۔

جب سے فرنیچ پرفیومز لمیٹڈ نے چرچ گیٹ میں فرانسیسی عطروں کی دکان کھولی تھی۔ بمبئی کے علاقے میں اس کی سیلز گرلز کی دھوم مچ گئی تھی۔ فرنچ پرفیومز لمیٹڈ کا مالک بلونت رائے ایک ہندوستانی تھا جو ایک عرصہ سے پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا۔ وہیں پر اس نے ایک فرانسیسی لڑکی سے شادی کی تھی۔ وہیں پر اس کے پانچ لڑکے پیدا ہوئے تھے۔ پچیس برس کے بعد وہ اپنے وطن لوٹ آیا تھا۔ اپنی بیوی بچوں کے ہمراہ یہاں آکر بھی اس کا ارادہ اپنے پرانے پیشے کو جاری رکھنے کا تھا۔ مگر اس کی بیوی مادام سوسنا نے اسے مشورہ دیا کہ ہندوستان میں رہ کر ہندوستانی مٹھائیاں بیچنا غلط ہوگا۔ اگر وہ پیرس میں ہندوستانی مٹھائیاں بیچتا تھا تو اسی قاعدہ سے ہندوستان میں فرانسیسی عطر بیچنا چاہیئے۔ مادام سوسنا تجارت کے اصول بہت اچھی طرح سے سمجھتی تھی۔ اسے افسوس تھا کہ اس کی اولاد میں کوئی لڑکی نہ تھی جسے وہ عطر کی دکان پر سیلز گرل (SALES GIRL) کا کام سکھا دیتی۔ اب لڑکوں کا عطر بیچنا ایسا ہی ہے جیسے بین کے آگے بھینس کا ناچنا۔ اور وہ خود اپنی جوانی کا سرمایہ اپنے شوہر اور بچوں میں لگا چکی تھی۔ بس یہی ایک سرمایہ ہے۔ اس دنیا میں جو سرمایہ دار کو واپس نہیں لوٹتا ہے۔ ورنہ ہمیشہ سود سمیت واپس ہوتا ہے۔ بلونت رائے اور مادام سوسنا نے بحالت مجبوری اخبار میں سیلز گرلز کے لئے اشتہار دیا تھا۔ خوش قسمتی سے انہیں بہت جلد ایک اچھی لڑکی مل گئی۔ موہنی کراچی کی پیداوار تھی۔ سیدھے سبھاؤ کی معصوم لڑکی تھی۔ نہ کوئی غمزہ نہ ادا۔ دو چوٹیاں شانوں پر بکھرائے ایک سلیٹی رنگ کی ساڑھی پہنے سیدھی کالج سے انٹرویو کے لئے آگئی تھی۔ موہنی کا باپ مر چکا تھا۔ ماں گٹھیا سے نیم اپاہج بن چکی تھی۔ اس کے دو چھوٹے چھوٹے بھائی تھے جو بالترتیب پانچویں اور ساتویں میں پڑھتے تھے۔ گھر میں سب سے بڑی وہی تھی۔ اس لئے باپ کا جوا اس کے کندھے پر آپڑا تھا۔ اور وہ جیسے تیسے نباہ رہی تھی۔ صبح میں وہ کالج جاتی جو سات سے ساڑھے دس تک کالج لگتا تھا۔ مارن بی روڈ کے نکڑ پر واقع تھا اور دفتروں میں کام کرنے والے لوگوں کی سہولت کے لئے کھولا گیا تھا۔ دن میں دو جگہ پارٹ ٹائم ٹائپسٹ کا کام کرتی تھی۔ زندگی سخت تھی۔ حالات نامساعد آرزوئیں مجبور دل بجھا بجھا سا، ایسا تو کوئی بھی نہیں ہے۔ جس نے اپنے ویرانۂ ہستی میں دو چار نخلستان نہ سجا رکھے ہوں۔ مگر موہنی اپنی زندگی پر جدھر نظر ڈالتی، کوسوں تک اسے ریت ہی ریت نظر آتی۔ کہیں کوئی پھول کی پتی تو کیا گھاس کی پتی بھی نظر نہ آتی تھی۔ صرف اس کی بڑی بڑی بھوری آنکھوں میں کبھی ایسے شفاف سائے لرزنے لگتے، جیسے بہت دور کہیں خواب رو رہے ہوں۔ صرف ان چند لمحوں میں اس کی ہستی بے حد دل آویز ہو جاتی تھی۔ اس وقت اگر کوئی اسے دیکھتا تو پتھر سے پتھر دل پانی ہو جاتا۔ مگر بمبئی میں نہ پتھر دل ہوتا ہے نہ نرم دل۔ بمبئی میں دل کی جگہ ایک کلاک رکھا ہوتا ہے جو ہر وقت ٹک ٹک کیا کرتا ہے۔ اب کلاک بڑی اچھی چیز ہے۔ بڑی کارآمد چیز ہے۔ مگر آپ کلاک سے محبت نہیں کر سکتے۔

بلونت رائے موہنی کی بسورتی ہوئی صورت دیکھ کر اسے واپس بھیجنے والا تھا۔ مگر نہ جانے کیسے سوسنا نے موہنی کی بھوری بھوری آنکھوں میں وہ شفاف سے سائے تیرتے ہوئے دیکھ لئے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے موہنی کو جاتے ہوئے روک لیا اور اسے اپنے پاس بلا لیا۔

سوسنا حسن کا شدید احساس رکھتی تھی۔ اس نے ایک نگاہ ہی میں موہنی کو پسند کر لیا۔ یہ لانبے لانبے سنہری



کرشن چندر



ہنسوں کی طرح بنی ہوئی چوٹیاں اگر کٹ جائیں اور بال پھیل کر شانوں پر بکھر جائیں تو کیا ہوگا۔؟

یہ سیدھی صف آرا پلکیں اگر ذرا گھوم کر روشن دمکتے ہوئے رخساروں پر حجاب آمیز ادا سے گر جائیں تو کیا ہو؟

یہ بھیگا گابی پختہ ذہن اگر شافرمی کی لپ اسٹک سے آشنا ہو جائے۔ وہ لپ اسٹک جو لبوں پر گھومتا ہے تو ایسا معلوم ہوتا ہے گویا یہ ہونٹ شعلوں کو کاٹ کر بنائے گئے ہیں وہ لپ اسٹک اگر ہونٹوں سے مس ہو جائے تو کیا ہو۔

جھاگ والے ربڑ کے نئے فیشن کی انگیا ذرا اُوپر کو اُٹھتی ہوئی وہ بے باک اٹھان نہیں ہے جسے آج کل عورتیں فیشن کی معراج سمجھتی ہیں بلکہ وہ جھجکتی ہوئی بیتن سی اٹھان جیسے کنواری ایک نگاہ اوپر اٹھائے دیکھ لے۔

کمر کس کے اندر سے باندھی ہوئی... حالانکہ اس کی ضرورت نہ پڑے گی۔ اس کے چھریرے لانبے بدن کی کمر یقیناً فرانسیسی عطر کی طرح نازک ہوگی۔

نہیں وہ اسے ساڑھی نہیں دے گی وہ اسے فرانسیسی گون پہنائے گی۔ سائے اور گون اور سلیکس اور جینز۔ اس سیلز گرل کے طرح طرح کے لباس ہوں گے۔ وہ اسے فرانسیسی عورتوں کے بہترین لباس دے گی۔ عطر کی طرح عورت کا لباس بھی بدلنا چاہیئے۔ صبح میں کچھ، سہ پہر میں کچھ، شام میں کچھ اور... وہ اس کے لئے کم سے کم پچیس لباس سلوائے گی۔

مادام سوسنا نے چند لمحوں ہی میں سب سوچ لیا اور اس نے بڑے پیار سے اپنے پاس بٹھالیا اور بولی۔

"تمہارا پرابلم (PROBLEM) کیا ہے؟ تم اتنی اداس اور اجڑی اجڑی کیوں ہو؟"

فرانسیسی عورت بہترین محبوبہ ہے۔ لیکن اگر وہ ماں بننا چاہتی ہے تو اس سے بہترین ماں کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اس کی میٹھی شہد آگیں آواز کو سن کر موہنی پگھل گئی۔ روتے روتے اس نے اپنی زندگی کی ساری داستان سنادی۔ داستان ہی تھا ہی کیا چند منٹ میں ختم ہو گئی۔

"چار سو روپے میں تمہارا کام چل جائے گا۔" سوسنا نے اس کے سر پر بڑی شفقت سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔

"میڈم" موہنی حیرت اور خوشی سے تقریباً چیخ کر بولی۔

"سوسنا"؟ بونت رائے بھی حیرت سے چیخا۔ مگر اس کی آواز میں بالکل خوشی نہ تھی۔

"پیچھے بیٹھو" مادام نے اپنے شوہر کو ڈانٹ دیا۔ "تم نہیں جانتے۔ یہاں ہم ہندوستانی مٹھائی نہیں بیچ رہے۔ فرانسیسی عطر بیچ رہے ہیں۔ چار سو روپیہ مہینہ بھی اس لڑکی کے لئے بہت کم ہے۔ تم اس کا پرابلم تو دیکھو۔"

"او بھیس" بونت رائے کسی زمانے میں جالندھر کا مشہور پہلوان ہوا کرتا تھا۔ اس کی شہرت کا راز یہ تھا کہ بڑے سے بڑے پہلوانوں سے ٹکر لینے کے لئے راضی ہو جاتا مگر ہمیشہ ہارتا تھا اور جب چاروں شانے چت گرتا تھا تو بڑی مایوسی سے چلا کر اپنے آپ سے کہتا تھا "او بھیس"۔

وہ پیرس اپنی پہلوانی کے کرتب دکھلانے گیا تھا اور

تمہارا پرابلم
کیا ہے؟ تم اتنی
اداس اور اُجڑی اُجڑی
کیوں رہتی ہو؟

جب چاروں شانے چت گرالیا۔ تب اس نے کشتی چھوڑ کر ہندوستانی مٹھائی بیچنے کا کاروبار شروع کر دیا تھا

سوسنا نے موہنی سے پوچھا "خوشبوؤں کے بارے میں تم کیا جانتی ہو۔؟"

"میں نے آج تک کبھی کوئی خوشبو نہیں لگائی۔" موہنی نے ڈرتے ڈرتے اقبال جرم کیا۔

سوسنا بے حد خوش ہو کر بولی۔ "تب تو بہت اچھا ہے۔ بہت مشکل ہوتا ہے۔"

"او بھیس" بونت رائے پھر بڑی مایوسی سے بولا۔ اسے صاف نظر آرہا تھا کہ اب تک اس نے جو کچھ ہندوستانی مٹھائی سے کمایا ہے اب وہ سب فرانسیسی عطر میں غارت ہوگا۔

"شٹ اپ"۔ سوسنا اسے دھمکاتے ہوئے بولی۔ بونت رائے فوراً شٹ اپ ہو گیا۔

"میں دو ماہ تک تم کو گھر پر ٹریننگ دوں گی۔" سوسنا موہنی سے بولی۔ دو ماہ کے بعد تم دکان پر کام کرنے لگو گی۔ دکان پر پہننے کے لئے کپڑے ہم دیں گے۔ لنچ کا خرچ ہمارا ہوگا۔ دکان بند ہوتے ہی تم شام کے لباس میں میرے گھر پر آؤ گی اور یہاں سے اپنا لباس تبدیل کر کے اپنے گھر جایا کرو گی۔ تمہارا گھر کہاں ہے۔؟"

"گھر کھرا بلڈنگ آٹھ نمبر کی کھولی، ناگپاڑہ۔"

سوسنا نے اس کا اڈریس لکھ لیا۔

ناگپاڑے کا نام سنتے ہی بونت رائے کو ایسا محسوس ہوا جیسے بہت سی بدبوئیں اس کی ناک میں گھس آئی ہوں۔ مگر وہ چپ رہا کیونکہ اس کی بیوی نے اسے شٹ اپ کر دیا تھا۔ اور وہ ایک وفادار خاوند تھا۔

سوسنا نے موہنی کے ہاتھ میں اپنا کارڈ دے کر کہا۔ "یہ ہمارے گھر کا پتہ ہے۔"

موہنی نے ایک نظر کارڈ پہ ڈالی۔

گیارہ نمبر وارڈن روڈ۔

اور پھر اس کارڈ کو اپنی انگیا میں ڈال کر چلی گئی۔

دو ماہ بعد جب چرچ گیٹ کے نکڑ پر روز اینڈ روز کمپنی فرینچ پرفیومرز لمیٹڈ کی دکان کھلی تو سارے علاقے میں فرانسیسی خوشبوؤں کی دھوم مچ گئی۔ کولابے سے کف پریڈ سے، وارڈن روڈ سے، میرین ڈرائیو سے، کمبالا ہل سے جوق در جوق لوگ فرانسیسی عطر خریدنے کے لئے آنے لگے۔ بعض منچلے تو دن میں دو دو مرتبہ عطر خریدنے کیلئے جاتے تھے اور موہنی ----------

موہنی کو اب کوئی پہچان نہ سکتا تھا کہ یہ وہی کمرشیل کالج میں پڑھنے والی بجھی بجھی سی سندھی لڑکی ہے۔ موہنی کے چمکتے ہوئے سنہرے بال تار عنکبوت کی طرح تاباں اس کے شعلے کی طرح بھڑکتے ہوئے ہونٹ اور ان ہونٹوں کے اندر بے حد سپید اور متناسب دانت، اس کی بھوری بھوسی شفاف چمکتی ہوئی آنکھیں، وہ چال ہندوستانی عورت کا سارا وقار لئے ہوئے، وہ آواز فرانسیسی عورت کا سارا

اعتماد لئے ہوئے اس کے فرنچ گاؤن، اس کی خوبصورت پرس، اس کے گرد پھولوں کی طرح لپٹی ہوئی عطر بیز مہک، متمول ترین علاقوں کی فیشن ایبل عورتیں، اس کے گاؤن دیکھنے آئی تھیں۔ آج اس نے کونسا گاؤن پہن رکھا ہے، کون سا پرس سنبھالے ہوئے ہے، کون سی خوشبو لگا رکھی ہے، میک اپ کا انداز کیا ہے؟ عورتیں اسے دیکھ کر پاگل ہونے لگتیں اور مرد پاگل ہو ہو کر اسے دیکھتے۔

اور موہنی کی زبان کیا چلتی تھی۔ وہ کم گو متین ہندوستانی لڑکی اب ایک لمحہ چپ نہ رہتی۔ کیونکہ اسے مادام نے بتا دیا تھا کہ چپ رہی تو تمھاری باتوں کی ساری خوشبو اڑ جائے گی، عطر بیچنا ہے تو گاہک کو ہر لحاظ سے باتوں میں اُلجھائے رکھو۔ ایک عطر کے بعد دوسرا عطر پیش کرتی جاؤ۔ عورتیں پچاس عطروں میں سے ایک عطر انتخاب کرتی ہیں۔ ہر دُم کیلئے اپنا سارا زور صرف ایک عطر بیچنے میں لگادو۔

جب درشن نے اسے دیکھا تو وہ کونٹر پر مؤدب کھڑی ہائی سوسائٹی کی مشہور سوشلائٹ مس خورشید اٹین والا کے سامنے عطر کی مختلف شیشیاں رکھے اس سے گفتگو میں مصروف تھی۔

"خوشبو کا راز اس بات میں ہے۔ مس اٹین والا کہ صحیح خوشبو خریدی جائے۔ اور صرف خوشبو خریدی جائے جس کی شخصیت خریدنے والی کی خوشبو سے مطابقت رکھتی ہو۔

"خوشبو کی شخصیت ہوتی ہے! موہنی؟ خورشید اٹین والا ہنس کر بولیں۔

ہاں مس اٹین والا ہر خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، اپنی ایک صورت ہوتی ہے، اس کا قد ہوتا ہے، رنگ ہوتا ہے۔ اب مثال کے طور پر گلاب کے عطر کو لے لو۔ گلاب کی خوشبو کے ہونٹ ... ذرا سونگھ کر دیکھئے نا... اس گلاب کی خوشبو کے ہونٹ کیسے سرخ اور گلاب سے بھرپور، بالکل آپ کے ہونٹوں کی طرح ... ہر وقت کسی نامعلوم جذبے سے تھرتھراتے ہوئے ..."

مس خورشید اٹین والا بے اختیار خوش ہو کر ہنسیں۔

"چنبیلی کی خوشبو دیکھئے، ذرا ملاحظہ فرمائیے۔ کیسی کم عمر، نوخیز چھریرے بدن والی نازک کمر والی خوشبو ہے۔ اپنے مستانہ خرام سے دلوں پر بجلیاں گراتے چلی جاتی ہے۔"

عطر اڑ جاتا ہے اور

محبت زندگی بھر ساتھ

نہیں چھوڑتی۔!!

"یہ پیرس کی رات، دراز قد، سیاہ گیسو پھیلائے ہوئے، اپنے نرم گال، آپ کے گالوں سے یوں لگا دیتی ہے کہ گال اور گیسو کے لمس سے آپ کے جسم میں گدگدیوں کے بلبلے سے پھوٹنے لگتے ہیں۔"

یہ جوہی کی کنواری خوشبو، پاکیزہ، سمٹی سمٹائی، چور نگاہوں سے آپ کے دل پر حملہ کرتی ہوئی کبھی ایک قدم آگے بڑھتی ہوئی، کبھی ایک قدم پیچھے ہٹتی ہوئی اس کی مہک ایک شرمیلی دوشیزہ کی طرح پرحجاب نظر آتی ہے۔

یہ سنگھار اج کی خوشبو، گوری گوری رنگت والی، نتھری صبح اور روشن خوشبو۔

بالکل آپ کے چہرے کی طرح مس اٹین والا اسے نہا کر ذرا سا جسم پر لگا دیجئے۔ ایسا معلوم ہوگا گویا اوشا بادلوں کے جھاگ سے دھل کر باہر نکل آئی ہے۔

نہ صرف یہ کہ خوشبو کی اپنی شخصیت ہوتی ہے، اس کا اپنا ایک لباس بھی ہوتا ہے۔

جو احساس میں کبھی تو ریشم کی طرح سرسراتا ہے، کبھی نائلان کی طرح پھسلتا ہے۔ کبھی شفان کی طرح لپٹتا جاتا ہے۔

اس لئے میڈم دنیا میں جو بھی سلیقہ شعار عورتیں ہیں، ہمیشہ کسی عُمدہ خوشبو کا سہارا لیتی ہیں۔

چند لمحوں کے لئے خوشبو کا حسن عورت کے حسن پر چھا جاتا ہے اور مرد سمجھتا ہے کہ عورت حسین ہے۔

حالانکہ صرف خوشبو حسین ہے۔

یہ آخری چوٹ مادام سوسانا نے خاص طور پر موہنا کو رٹائی تھی۔ عورتیں پرلے درجے کی خود غلط ہوتی ہیں۔ ان کے حسن کی تعریف کرو، ضرور کرو، وہ اس سے خوش ہوتی ہیں۔ مگر کہیں پر ان کے اندر ایک لمحہ کے لئے احساس کمتری بھی پیدا کردو، کہ جس کی چوٹ کھا کر وہ تمہارے عطر کو اپنے حسن کے لئے ضروری خیال کریں ورنہ وہ تمہارا عطر کیوں خریدیں گے۔ عورت بڑی پریکٹیکل ہوتی ہے، موہنی۔

مس اٹین والا وہ خوشبو خرید لے گئیں۔ روز جس کے ہونٹ موہنی کے الفاظ میں مس اٹین والا کے ہونٹوں سے مشابہت رکھتے تھے۔ (حالانکہ نہیں رکھتے تھے) اور سنگھار اج، جس کی رنگت خورشید اٹین والا کی رنگت سے ملتی جلتی تھی۔ ایک سو ستر روپے کا بل ہوا۔ حالانکہ بھنڈی بازار والے عطر فروش یہی دونوں خوشبوئیں دس پندرہ روپے میں دے دیتے۔ مگر وہ بھی کمبخت کیا عطر بیچتے تھے۔ لوہے کی ایک پتلی سی سلائی پر روئی کے پھاہے میں عطر لگا کر بیچتے تھے جیسے وہ عطر نہ بیچ رہے ہوں کانوں سے میل نکال رہے ہوں۔ درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے دل کے، دامن کے سارے تار چھیڑ دیئے۔ وہ موہنی کو بھونچکا دیکھتا ہی رہ گیا۔ اور جب مس اٹین والا کے چلے جانے کے بعد وہ اس سے مخاطب ہوئی۔

"فرمائیے۔ آپ کو کون سا عطر چاہیئے؟"

تو وہ بے حد گڑبڑا گیا۔ وہ تو محض اسے دیکھنے کے لئے دکان کے اندر آگیا تھا بے اختیار اس کے مدہوش کر دینے والے حسن سے کھنچا ہوا اندر آگیا تھا۔ اب یہ لڑکی اس سے کیا پوچھ رہی تھی۔

وہ بے حد گڑبڑا کر بولا۔

"جی؟"

جیسے اسے کچھ نہ خریدنا ہو۔ خریدنا موہنی کو ہو۔

"کوئی عطر دکھاؤں یا روڈی کلون؟

ہم نے پیرس سے نئے روڈی کلون منگائے ہیں۔ یہ سپین کی وادیوں کے اصلی روڈی کلون ہیں، یہ صبح کے وقت نہا دھو کر استعمال کرنے والا روڈی کلون ... یہ دوپہر کی گرمی کی تمازت دور کرنے والا روڈی کلون ... یہ کام سے فارغ ہو کر چہل قدمی کے لئے جانے سے پہلے استعمال کرنے والا

روڈی کلون... یہ رات کے ڈانس میں جانے سے پہلے برتنے والا روڈی کلون... مکمل سیٹ ایک سو گیارہ روپے کا ہے۔ سپین کی وادیوں میں مہکنے والے پھولوں کا اصلی روڈی کلون۔

"جی... جی... مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔" درشن نے شرما کر کہا اور اس کا چہرہ کانوں تک سرخ ہو گیا۔

میں تو صرف آپ کو دیکھنے کیلئے آیا تھا... دفتر میں بہت لوگوں نے..."

موہنی نے حجاب آمیز نگاہوں سے اپنی پلکیں جھکا لیں۔ بالکل اسی طرح جس طرح اس موقع کے لئے مادام نے بتایا تھا دوسری بار جب اس نے پلکیں اٹھائیں تو درشن وہاں سے جا چکا تھا۔ موہنی کے دل کو ایک عجیب دھچکا سا لگا۔ مرد تو بہت آتے تھے دکان پر۔ مگر ان میں سے بیشتر بے ایمان تھے آتے تھے اسے دیکھنے کے لئے۔ لے کے جاتے تھے عطر اور خوشبو اور روڈی کلون، ہیئر آئل، شیمپو اور کریم...

مگر یہ کیسا لڑکا تھا، شرما بھی گیا اور بے جھجک سب کچھ کہہ بھی گیا۔ پھر کچھ خریدے بھی نہ لے گیا۔ شاید وہ کچھ خریدنے نہ آیا تھا، کچھ دینے آیا تھا۔ شام تک موہنی کو اپنا دل کچھ خالی خالی سا لگنے لگا، جیسے اس کی ساری دُکان لوٹی جا چکی ہے۔ کسی نے اس کے دل کے دریچے میں جھانک کر وہاں کے سارے عطر چُرا لئے ہیں۔

اُونہہ! موہنی نے اپنے سر کے بالوں کو جھٹک دیا۔ اسے اس طرح کی باتیں نہیں سوچنا چاہیئے۔ مادام نے اسے خبردار کر دیا تھا۔ سب کچھ ہو گا مگر عشق نہیں ہو گا۔ لوگ تمہیں گھومنے کے لئے بلائیں گے مگر تم کہیں جاؤ گی نہیں۔ لوگ تمہیں پارٹیوں میں مدعو کریں گے، چائے کی دعوت دیں گے۔ اک ذرا دو منٹ کے لئے تخلیہ چاہیں گے مگر تم ہمیشہ انکار کر دو گی۔ کیونکہ تم عطر بیچنے والی ہو۔ عطر اور محبت میں بھی فرق ہے۔ عطر ذرا سی دیر کے لئے مہکتا ہے، پھر اُڑ جاتا ہے۔ محبت اگر ساتھ لپٹ جائے تو زندگی بھر ساتھ نہیں چھوڑتی۔ اگر عطر بیچنا چاہتی ہو تو اس چکر میں مت پڑنا۔

شام کے ساڑھے چھ بجے سوسنا کی گاڑی اسے لینے کے لئے دکان کے باہر آ پہنچی۔ پہلے تو موہنی نے اندر جا کے باتھ روم میں اپنا میک اپ ٹھیک کیا۔ بالوں کو سنوارا شام کا خوبصورت لباس پہنا۔ یہ لباس پہننا بے حد ضروری تھا۔ کیونکہ اسے معلوم تھا کہ باہر شوقین مزاج نوجوانوں اور رئیس زادوں کی لمبی لمبی گاڑیاں کھڑی ہوں گی۔ سب اسے دیکھنے کے لئے کھڑے ہوں گے۔ اس وقت اسے دکان سے ایک پُراسرار شہزادی کی طرح حسین اور دور افتادہ بن کر نکلنا ہو گا۔

وہ بڑی تمکنت سے باتھ روم سے باہر نکلی۔ بلونت رائے کو اس نے سر کی جنبش سے سلام کیا۔ اور پھر پرس جھلاتی ہوئی باہر آ گئی۔ ڈرائیور نے سلوٹ مار کر اس کے لئے کار کا دروازہ کھولا۔ تماشائیوں کی نظریں اس پر گڑ گئیں۔ کچھ سیٹیاں بجیں، کچھ ہائے وائے ہوئی۔ کچھ چنگاریاں لپکیں، کچھ آہیں بھڑکیں، پھر گاڑی وارڈن روڈ کی جانب چلی گئی۔

بھیڑ میں درشن بھی کہیں چھپا کھڑا تھا۔ موہنی کو اس لباس فاخرہ میں نکلتے دیکھ کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ کیسی غلطی کی اس نے جو وہ اس سیلز گرل کو دل دے بیٹھا۔ یہ تو جانے مالا بار ہل یا وارڈن روڈ کی کوئی شہزادی ہے جو کار میں بیٹھ کے آتی ہے۔ کار میں جاتی ہے۔ جس کے گاؤن پیرس سے سل کر آتے ہیں۔ جس کے بال "تاج" میں ڈھلتے ہیں، اور جس کا جسم نیویارک کے میک اپ کے بغیر مکمل نہیں ہوتا۔ اس نے تو شاید شغل کے طور پر عطر بیچنے کا کام اختیار کر لیا ہے۔ آج کل کی متمول گھرانوں کی عورتوں نے بھی کام کرنا بطور ایک فیشن اختیار کر لیا ہے۔ اسے بھول جاؤ۔ آرام سے اپنی فرم میں ڈھائی سو روپے کی ملازمت کرتا جا، اور اگر عشق کرنے کا اتنا ہی شوق ہے تو وہ تیرے دفتر میں مس ڈی سوزا کیا بُری ہے۔ ڈیڑھ سو روپے ماہوار لیتی ہے، بار بار تیری میز پر آ کر جھک جاتی ہے اور اپنا نیم عریاں سینہ دکھا کر چلی جاتی ہے۔ شفان کا خیال چھوڑ دے اپنی کاٹن کی کھال میں مست رہ!

مگر درشن سے رہا نہیں گیا۔ دوسرے دن وہ پھر فرنچ پرفیومرز کی دکان پر گیا۔ تیسرے دن بھی گیا۔ چوتھے دن بھی گیا اور پانچویں دن بھی گیا۔ ہر روز وہ شیو کرنے کے بعد استعمال کرنے والی روڈی کلون دس روپے میں خرید لیتا تھا اور کچھ نہیں کہتا تھا۔ بس وہی ایک روڈی کلون خریدتا اور خرید کر باہر چلا آتا... نہ وہ مسکراتا تھا نہ کوئی بات کرتا تھا۔

چھٹے دن موہنی نے کہا۔ "روڈی کلون کی کتنی شیشیاں خریدو گے۔"

"پچیس۔"

"پچیس کیوں۔"

"یہ بات ہے۔" درشن نے اسے نہایت سادگی سے سمجھاتے ہوئے کہا۔ "میری تنخواہ ڈھائی سو روپے ہے۔ میں اس تنخواہ سے روڈی کلون کی صرف پچیس شیشیاں خرید سکتا ہوں۔ اس لئے ہر روز میں ایک شیشی خرید کے لے جاتا ہوں۔ پچیس تاریخ تک خریدتا رہوں گا۔ پھر پانچ دن نہیں آؤں گا۔

پھر یکم کو آؤں گا۔

اور یکم سے پچیس تک آتا رہوں گا...!

"کتنے سال کا پلان ہے؟" موہنی نے شوخی سے پوچھا۔

"کہہ نہیں سکتا۔ جب تک جیب ساتھ دے یا وقفہ ملتا رہے یا کوئی دوسرا پارٹ ٹائم جاب ملتا رہے۔"

جب تین مہینے اسی طرح گزر گئے تو موہنی کو سخت وحشت سی ہونے لگی۔

"مگر یہ تو سخت حماقت ہے، مسٹر!"

"درشن میرا نام ہے۔" درشن بولا۔ "میں جانتا ہوں یہ ایک حماقت ہے۔ کہاں تم وارڈن روڈ پر رہنے والی شہزادی کہاں میں ایک معمولی فرم کا کام کرنے والا کلرک۔ تمہارا خیال ہے میں جانتا نہیں ہوں میں کیا کر رہا ہوں۔ مجھے بڑی مصیبت اٹھانی پڑتی ہے۔ راتوں کو چار چار گھنٹے اکسٹرا ٹائپ کرنا پڑتا ہے۔ انگلیاں دُکھ جاتی ہیں مگر....

یکایک وہ چپ ہو گیا۔

موہنی کا دل دھڑکنے لگا۔ آہستہ سے بولی۔ "مگر کیا؟"

"کچھ نہیں۔ ذرا وہ میری روڈی کلون دیدو۔"

روڈی کلون لینے موہنی مڑ رہی تھی کہ اتنے میں ایک گھوڑے کے چہرے اور گھوڑے کے سے دانتوں والی ایک انگریز عورت بڑی گھبرائی ہوئی سیاہ ماتمی لباس پہنے ہوئے داخل ہوئی۔

موہنی فوراً اس کی طرف متوجہ ہو گئی۔

"مجھے خوشبو چاہیئے۔"

"کیسی مادام؟"

"کیسی بھی دیدو۔ کوئی اچھی سی خوشبو۔ میں نے سنا ہے کہ تمہاری دکان سے بہتر خوشبو بمبئی میں کہیں نہیں ملتی۔ اس لئے میں نے سوچا۔ اس مصیبت میں تمہارے سوا اور کس کے پاس جاؤں؟"

"تھینک یو مادام ... تھینک یو ... مجھے آپ کی مصیبت میں آپ سے بڑی ہمدردی ہے۔ اور آپ کا یہ ماتمی لباس دیکھ کر میں خود سوچ میں پڑ گئی ہوں کہ آپ کو کونسی خوشبو دوں۔ شاید آپ کا کوئی عزیز ...؟"

"عزیز نہیں، گھوڑا مار کہ انگریز عورت فیصلہ کن لہجے میں بولی "میری زندگی کا سب سے عزیز، سب سے چہیتا، سب سے پیارا مجھے داغ مفارقت دے گیا ہے میرا ٹونی"۔

"ٹونی؟ آپ کا شوہر؟"

"گوڈ ہیونس، نو ٹونی میرا کتا ..."

او معاف کرنا مادام ... مجھ سے بھول ہوئی دراصل اتنے سوال کرنے کی اس لئے ضرورت پڑی کہ ماتمی خوشبوئیں بھی کئی طرح کی ہوتی ہیں۔

محبوب کے مرنے پر ایک خوشبو لگائی جاتی ہے، کتے کے مرنے پر دوسری، شوہر کے مرنے پر تیسری اور بچے کے مرنے پر چوتھی۔

ہمارے ہاں ماتمی خوشبوؤں کی قسمیں الگ الگ ہیں۔ آپ ... یہ خوشبو لے جایئے۔ سٹونی ہارٹ!"

"سٹونی ہارٹ؟"

جی ہاں دیکھئے اور اس کا نام بھی کس قدر آپ کے کتے سے ملتا جلتا ہے۔ ٹونی ہارٹ اور سٹونی ہارٹ میں کس قدر فرق ہے؟ معلوم ہوتا ہے۔ یہ خوشبو صرف آپ کے کتے کے ماتم کے لئے بنائی گئی ہے ..."

"سٹونی ہارٹ! واقعی!" انگریز عورت پرس کھولتے ہوئے بولی "واقعی وہ پتھر دل کتا تھا، مجھے اکیلا چھوڑ کر چلا گیا"۔ انگریز عورت کے لہجے میں آنسوؤں کا ہلکا سا اشارہ تھا۔ پرس کھول کر بولی "کتنے پیسے ہوں گے"؟

"صرف ساٹھ روپے!" موہنی نے بڑی عاجزی سے کہا۔

"صرف ساٹھ روپے"؟ انگریز عورت ذرا متعجس ہو کر بولی۔ پھر خود ہی لہجہ بدل کر بولی "مگر تم ٹھیک کہتی ہو، یہ خوشبو بہت عمدہ ہے۔ بوجھل ... بوجھل، اداس سی اور کچھ کھردری سی خوشبو، بالکل میرے ٹونی کے روئے اور خشک بالوں کی طرح ... میں اسی کو لے جاؤں گی۔ اس سے مجھے اپنا ٹونی یاد آئے گا۔ تھینک یو ویری مچ!"

ساٹھ روپے دے کر جب انگریز عورت چلی گئی تو موہنی نے معافی مانگتے ہوئے درشن کو روڈی کلو کی نئی شیشی لادی۔"

"ساری آپ کو انتظار کرنا پڑا۔"

"نہیں ... بلکہ مجھے تو زیادہ وقت مل گیا۔"

موہنی خاموش کھڑی رہی ...

چلتے چلتے درشن نے کہا۔ "گوڈ بائی سٹونی ہارٹ!"

اس کی آنکھوں میں آنسو تھے ....

موہنی کا دل لرزنے لگا ....

نہیں نہیں، میں عشق تو کر ہی نہیں سکتی ...

مجھے کوئی حق نہیں ہے۔ اتنی اچھی چار سو کی نوکری مجھے کہاں ملے گی۔ ان چار سو روپوں میں میری ماں کا علاج بھی ہو رہا ہے۔

میں اپنی اندھی خالہ کو پیسے بھیجتی ہوں۔ میرے دونوں بھائیوں کی تعلیم انگریزی اسکول میں پوری ہو سکتی ہے۔ مجھے یوں ہی رہنا ہے۔ کیا ہی اچھا ہوتا اگر درشن بھی دوسرے نوجوانوں کی طرح ہوتا، جو اسے دیکھنے کے لئے دکان میں آتے تھے اور اس سے طرح طرح کے مذاق کرتے تھے۔ شستہ مذاق، مخمل میں لپٹے ہوئے مذاق۔ مگر ایسے مذاق جن کے اندر غلیظ خواہش کی تیز چھری چھپی رہتی تھی، جس کی دھار کبھی کبھی باتیں کرتے ہوئے عیاں بھی ہو جاتی تھی۔ امیر طبقے کے شہزادے، ملوں کے ہونے والے مالک، ٹھیکیداروں کے سپوت، رشوت لینے والے افسروں کے صاحب زادے گلیمر کے ہالے میں دمکتے ہوئے ماہتاب کی طرح خوبصورت فلمی ہیرو، جو ایک رات میں بیس ہزار پھونک سکتے تھے، وہ سب اس کی ایک نگاہ ناز کے متمنی تھے۔ مگر صرف ایک نگاہ ناز کے، وہ کوئی عمر بھر کا پیمان باندھنے کے لئے نہیں آتے تھے، جیسے وہ عطر خریدنے آتے تھے اور عورت کی آب

سی وقت تک ہے جب تک وہ اپنی عزت کی شیشی

عطر کی شیشی کھلی اور آب غائب۔ یہ مرد

اور عطر ہمیشہ بدلے جاتے ہیں۔

ے سمجھایا تھا۔

مگر پھر بھی درشن اسے اس طرح نہیں لگتا۔ کوئی اس کے دل کے اندر بولتا تھا اور کہتا تھا۔ یہ تو ایسا نہیں ہے، ... کچھ کہتا بھی نہیں ہے۔ کوئی مخمل میں لپٹا ہوا گندہ مذاق نہیں کرتا، اس کی آنکھوں میں کیسی شرافت ہے، کیسی وارفتگی ہے، دل وجان سے چاہنے کی کیسی آرزو ہے اس کے پریشان بالوں کی لٹ اسے اس قدر پیاری کیوں معلوم ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کا جی چاہتا ہے کہ وہ اسے اپنے سینے سے لپٹا لے۔ دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھام کر آنکھیں بند کر کے اسے اپنی ہی ... سے لگا لے۔

ہائے یہ کیسی کاہش ہے جو میری جان کو کھائے جاتی ہے مگر ... نہیں ... مجھے اس طرح سوچنے کا کوئی حق نہیں ہے۔ وہ تو مجھے آسمانوں پر اڑنے والی شہزادی سمجھتا ہے۔ میں اس کا سندر سپنا کیوں چور چور کر دوں۔ اس نے تو ہمیشہ فرانسیسی گاؤن میں دیکھا ہے۔ خوشبوؤں میں لپٹا ہوا زرکار پرس جھلاتے ہوئے مادام کی گاڑی میں دیکھا ہے۔ اسے کیا معلوم میں ایک بدبخت لڑکی ہوں۔

ناگپاڑے کی ایک گندی چالی میں ایک بدبودار کوٹھری میں اپنے دونوں بھائیوں اور گٹھیا کی ماری ہوئی ماں کے ساتھ رہنے والی، جسے ہر ماہ سو روپے اپنی اندھی خالہ کو بھیجنا پڑتا ہے، اگر اسے حقیقت معلوم ہو جائے تو کیا وہ مجھ سے پریم کر سکے گا۔ ہرگز نہیں، ہرگز نہیں۔ اچھا ہے یہ دھوکا یوں ہی رہے۔ مگر اس کا اس طرح سے آ کر اپنے آپ کو لٹاتا تو مجھے اچھا نہیں لگتا۔ بالکل غلط ہے، بالکل غلط ہے اگر میں اس سے پریم نہیں کر سکتی تو مجھے اسے برباد تو نہ کرنا چاہیئے۔ مجھے اس سے سرد مہری کا سلوک کرنا چاہیئے۔ ایسا سلوک جس سے اس کے دل میں میرے لئے نفرت کی آگ بھڑک اٹھے، وہ مجھ سے شدید نفرت کرنے لگے۔ مجھے ہمیشہ کے لئے بھول جائے اور اگر یاد بھی کرے تو ایک بری ناکارہ بدمعاش آوارہ لڑکی کی طرح ....

جس دن موہنی نے یہ فیصلہ کیا اس دن وہ بے حد اداس اور تھکی ہوئی دکھائی دیتی تھی۔ اور مادام نے اس کے زرد زرد اڑے اڑے چہرے کی رنگت کو دیکھ کر اس کی طرف اشارہ بھی کیا۔ مگر موہنی نے یہ کہہ کر ٹال دیا کہ اسے آج بہت کام کرنا پڑا ہے۔

گاہکی بہت زیادہ تھی اور وہ بے حد تھکی ہوئی تھی۔

گاؤن اتار کر اس نے اپنی سادہ ہینڈلوم کی ساڑھی پہن لی۔ اور پرانے سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی موہنی وارڈن روڈ کے عالی شان فلیٹ سے آ کر ایک بس میں سوار ہو کر ناگپاڑے چلی گئی۔

موہنی کے پلان کا شروع میں تو خاطر خواہ اثر نہ ہوا۔ درشن بھی بے حد ڈھیٹ تھا۔ مگر موہنی نے سوچ لیا تھا کہ وہ بھی ڈھٹائی کا جواب مکمل ڈھٹائی سے دے گی۔ یہ قصہ اس کی ہمت میں چوپٹ کر رہا تھا۔ اس کے کام میں حارج ہو رہا تھا۔ اس کی راتوں کی نیند حرام کر رہا تھا۔ اب اس قصے کو ختم ہو جانا چاہیے۔ جس قصے کا خاطر خواہ کوئی انجام نظر میں نہ ہو۔ اسے ڈھکیل دینے سے کیا فائدہ؟

اب درشن کو دیکھتے ہی موہنی تیوری چڑھا لیتی۔ وہ اس کے لیے روڈی کلون کی شیشی اور بل کاٹ کے الگ سے تیار رکھتی۔

درشن آتا۔ موہنی اس کے ہاتھ میں بل اور شیشی تھما دیتی۔ اور تھینک یو کہہ کے دوسرے گاہک کی طرف متوجہ ہو جاتی۔ اس پر بھی درشن باقاعدگی سے آتا رہا۔ وہ کچھ بجھ سا گیا تھا، مگر پھر بھی آتا رہا۔

خیر موہنی کو آخری حملہ کرنے کا موقع مل گیا۔ اور موقع کی وہ تلاش میں ہی تھی۔ اس روز گروپ کیپٹن لال کاکا اس کے قریب کھڑا اس سے عطریات کے فن پر بحث کر رہا تھا۔

گروپ کیپٹن لال کاکا دوسری جنگ عظیم کا نامور ہوا باز تھا۔ وہ آرمی سے ریٹائر ہو چکا تھا اور ذرا سا لنگڑا کر چلتا تھا۔ چالیس برس کی عمر میں بھی وہ بڑی مشکل سے تیس کا دکھائی دیتا تھا۔ اس کا گورا رنگ جیسا کہ پارسیوں کا ہوتا ہے۔ اس کے گھونسے ہوئے بال، مضبوط ٹھوڑی اور چھوٹی چھوٹی پُر وقار مونچھیں، اس کے چہرے کو عجیب وجاہت عطا کرتی تھیں۔

وہ بڑا بانکا اور سجیلا تھا۔ ہائی سوسائٹی کی خوبصورت لڑکیوں میں قاتل کے نام سے مشہور تھا۔ لڑکیاں تو اس کے ذرا سے لنگڑانے پر بھی جان دیتی تھیں۔ بولتے بولتے اس کی زبان میں کسی وقت جو ذرا سی لکنت پیدا ہوتی تھی اسے بھی لڑکیاں بے حد پسند کرتی تھیں۔ گروپ کیپٹن لال کاکا چار سال پیرس میں رہ چکا تھا۔ اس لیے اسے فرانسیسی عطریات سے بڑی دلچسپی تھی۔ کیونکہ فرانسیسی لڑکیوں کے نفسیات میں عطر کو بہت دخل تھا۔ اس لیے ہر سمجھدار نوجوان کے لیے جو عورتوں میں مقبول ہونا چاہتا ہے اس کے لیے یہ بے حد ضروری ہے کہ عطر کے بارے میں بھی تھوڑی سی واقفیت رکھتا ہو۔

گروپ کیپٹن لال کاکا اکثر فرینچ پرفیومرز سے عطر خریدنے آیا کرتا تھا۔ اور موہنی سے باتیں کرنے میں اسے بڑا لطف آتا تھا۔ اس وقت بھی وہ موہنی سے باتیں کر رہا تھا جب درشن دکان کے اندر داخل ہوا۔ موہنی نے اس کی طرف کوئی توجہ نہ دی۔ وہ گروپ کیپٹن لال کاکا سے باتیں کرتی رہی۔

موہنی ہنس کر بولی۔

کیپٹن لال کاکا... عطر کا بھی ایک وقت ہوتا ہے۔ ایک ماحول ہوتا ہے۔ لیکن کچھ لوگ ہوتے ہیں۔ نہ وقت دیکھتے ہیں نہ ماحول کا خیال کرتے ہیں۔

درشن کا رنگ فق ہو گیا۔

گروپ کیپٹن لال کاکا نے اپنے سینے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

مثال کے طور پر میں نے اس وقت جو خوشبو لگا رکھی ہے اس کے متعلق تم کیا کہو گی۔

موہنی گروپ کیپٹن کے سینے کی طرف جھکی۔ اور جھکی۔ اس کے بال گروپ کیپٹن کی ٹھوڑی سے چھو گئے۔ درشن کو ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کے کلیجے میں چھری گھونپ دی۔ وہ اپنے ہونٹ کاٹنے لگا۔

میں تمہیں اس عطر کا نام تک بتا سکتی ہوں۔ اور یہ بھی بتا سکتی ہوں کب تم نے اسے لگایا تھا۔

"کب؟"

"تقریباً دو گھنٹے ہوئے ہیں۔"

"درست۔"

"اس عطر کا نام آخری بوسہ ہے۔"

گروپ کیپٹن ہنسا۔

"ٹھیک کہتی ہو مگر..." پھر لہجہ بدل کر دھیرے سے بولا۔ "ابھی تو میں پہلے بوسہ کی امید میں ہوں۔"

"لالی!"

موہنی بڑے پیار سے اور بناوٹی غصے سے گروپ کیپٹن لال کاکا کو جھڑک کر بولی۔

مگر درشن کو اس میں نہ بناوٹ دکھائی دی نہ غصہ۔ اسے صرف پیار ہی پیار نظر آیا۔ کیسی دمکتی ہوئی مسکراہٹ تھی موہنی کی۔ کس پیار سے وہ گروپ کیپٹن لال کاکا کو دیکھ رہی تھی اور اس نے اسے "لالی" کہا تھا۔

موہنی بولی۔ "یہ بیڈروم کا عطر ہے اسے لگا کر باہر نہیں گھوما کرتے۔"

"کیوں نہیں گھوم سکتے؟" گروپ کیپٹن نے پوچھا۔

"اگر تم بیڈروم کا پاجامہ سوٹ پہن کر باہر گھوم سکتے ہو تو ضرور اس عطر کو لگا کر بھی گھوم سکتے ہو۔ اگر تم پیرس میں ہوتے تو لوگ یقیناً تمہارا مذاق اڑاتے۔"

"تو مجھے اس وقت کون سا عطر لگانا چاہیے۔"

"مس؟" درشن ذرا بے چینی سے بولا۔

"پلیز!" موہنی نے اسے ہاتھ کے اشارے سے انتظار کرنے کو کہا۔ اور پھر مسکرا کر لال سے باتیں کرنے لگی۔

"بتاؤ نا موہنی!... میں اس وقت ایک ڈرائنگ روم میں جا رہا ہوں اور ہو سکتا ہے کہ بیڈروم میں بھی جانا پڑ جائے..."

"بے حد شریر ہو!" موہنی پھر بناوٹی غصہ سے بولی۔ "میں تم کو ایک ایسا عطر دیتی ہوں جو ڈرائنگ روم اور بیڈروم دونوں جگہ کام آ سکتا ہے۔"

موہنی عطر تلاش کرنے لگی۔

گروپ کیپٹن بلند آواز میں بولا۔ "تم نے ہمیشہ انکار کیا ہے۔ مگر اب میں انکار کا ایک لفظ نہیں سنوں گا۔ کل میری سالگرہ ہے۔ تمہیں پارٹی میں آنا ہو گا۔"

"اگر تم مجھے لینے آ گئے تو میں تمہارے ساتھ چلوں گی۔"

گروپ کیپٹن لال کاکا نے زور سے پُر مسرت سیٹی بجائی۔

درشن جلدی سے قدم اٹھاتا ہوا دکان سے باہر چلا گیا۔ موہنی نے کنکھیوں سے اسے باہر جاتا ہوا دیکھا جب وہ عطر لے کر واپس آئی تو گروپ کیپٹن نے چلا کر کہا۔

"تمہارے چہرے کو کیا ہوا۔ اس قدر زرد پیلا..."

موہنی نے اپنے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا "مجھے چکر آرہا ہے!"

اس کے بعد دو ماہ تک درشن کی صورت دکھائی نہیں دی۔ نہ وہ دکان پر آیا، نہ باہر کی بھیڑ میں کبھی دکھائی دیا جہاں سے موہنی کے دل میں ایک جھرنا سا پھوٹتا تھا۔ وہاں پر موہنی نے اب ایک بڑی سی پتھر کی سِل رکھ دی۔ اندر سے زخم رِستا رہے، رِستا رہے۔ باہر سے کچھ قطرہ نہ آئے۔ البتہ راتوں کو اب بھی اسے نیند نہ آتی تھی۔ اسے سلیپنگ پلز لینے کی عادت پڑ گئی۔ محبوب کو واپس بلانے کی دوا تو کسی ڈاکٹر نے ایجاد نہیں کی۔ لیکن نیند کو تو دوا کے زور پر بلایا جا سکتا ہے۔ یہی غنیمت ہے۔

ایک روز وہ آیا۔ وہ بے حد دبلا ہو گیا تھا۔ کم سے کم موہنی نے درشن کو اس قدر بیمار اور دبلا کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے کپڑے بھی اچھے نہ تھے۔

پتلون میں کریز نہ تھی۔ قمیض کے دو بٹن غائب تھے۔ آنکھوں سے معلوم ہوتا تھا کہ کئی دن سے نہیں سویا ہے۔ داڑھی بھی بڑھی ہوئی تھی، مگر نہ جانے کیوں درشن کو دیکھ کر موہنی کا دل اندر سے پگھلنے لگا۔ اس کی بڑھی داڑھی والا چہرہ بے حد دلکش معلوم ہوا مگر وہ چپ سی حیران کھڑی کی کھڑی اسے دیکھتی رہ گئی۔

درشن نے کہا "مجھے سٹونی ہارٹ کی ایک شیشی دیدو۔"

موہنی بولی "کیا تمہارے ہاں کسی کی موت ہو گئی ہے؟"

"نہیں۔ میری شادی ہونے والی ہے۔"

موہنی کا دل ایک لمحہ کے لئے رُک گیا۔ رُک کر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ اس کا سارا جسم لرزنے لگا۔ اس کے ہاتھ پاؤں اس کے قابو میں نہ تھے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کیا کہے۔ کس سے کہے۔ کیونکر کہے۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ پر قابو پا کر چہرہ پر ایک مصنوعی تبسّم لا کر کہا۔

"سٹونی ہارٹ تو ماتمی خوشبو ہے۔ شادی کے لئے موزوں نہیں ہے۔ کیا آپ... آپ کی شادی ہو رہی ہے؟"

"میرے گاؤں میں میرے باپ کر رہے ہیں۔ میں نے ہاں کر دی ہے۔ آج رات کو جا رہا ہوں۔" درشن رُک رُک کر بولا۔ اس کا چہرہ بے حد سنجیدہ تھا۔

"میں آپ کو ایک بہت عُمدہ خوشبو... آپ کی دُلہن کے لئے دوں گی... جائیے... ۵۷ ت مسرت اپنی طرف سے تحفہ میں دوں گی..."

درشن نے کوئی جواب دیئے بغیر سٹونی ہارٹ عطر کے دام کونٹر پر رکھ دیئے۔ موہنی کے لئے کوئی راستہ باقی نہ رہا۔ اس نے سٹونی ہارٹ کی شیشی اٹھا کر درشن کو دے دی۔ درشن نے شیشی اس طرح سے اپنے دونوں ہاتھوں میں لے لی، جیسے موہنی سے اپنے جُرم کی آخری سزا پا رہا ہو۔ شیشی لے کر وہ سر جھکائے دھیرے سے باہر جانے لگا۔

"مت جاؤ درشن" موہنی نے اپنے دل ہی دل میں کہا۔ اندھے بے وقوف، احمق۔ کیا تم نہیں جانتے کہ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔؟ کیا تم صرف میرا فرنچ گاؤن دیکھتے ہو۔ میرا امریکی پرس دیکھتے ہو۔ یہ سنہری زُلفیں دیکھتے ہو۔ رنگین ناخن دیکھتے ہو، وہ زخم نہیں دیکھتے جو میرے دل کے اندر ہی اندر رِس رہا ہے۔ میرے حالات دیکھو، میری مجبوری تو دیکھو... مت جاؤ درشن میں ایک امیر شہزادی نہیں ہوں۔ تمہاری طرح ایک غریب لڑکی ہوں۔ جس کی ایک بوڑھی ماں ہے۔ ایک اندھی خالہ ہے۔ دو چھوٹے چھوٹے بھائی ہیں جو ناگپاڑے کی ایک گندی چال میں رہتے ہیں۔ درشن کیا تم تین سو روپے میں ہم سب کو سنبھال نہیں سکتے۔ ارے میں گھر کے سارے کپڑے دھو دوں گی۔ خود اپنے ہاتھ سے استری کروں گی۔ تمہارے لئے کھانا پکاؤں گی۔ اپنے ہاتھ سے تمہیں کھلاؤں گی۔ اور جب تم تھکے ہارے سو جاؤ گے تو تمہارے پاؤں دباؤں گی۔ مجھے اپنے چرنوں سے لگا لو درشن، میرے کپڑے فرانس کے ہیں لیکن میرا دل ہندوستانی عورت کا ہے۔ ظالم مت جاؤ... مجھ سے مت کچھ کہلواؤ۔ میری صورت کو دیکھ لو... دن رات فائلیں پڑھنے والے درشن، کیا تم ایک غریب لڑکی کے چھوٹے سے چہرے کو نہیں پڑھ سکتے!

مگر موہنی کچھ کہہ نہ سکی۔ درشن دھیرے دھیرے دکان سے باہر نکل گیا۔

درشن کے چلے جانے کے بعد وہ یکایک چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

جب وہ ہوش میں آئی تو اس نے اپنے آپ کو وارڈن روڈ کے فلیٹ میں پایا۔ مادام سوسنا ہر طرح سے اس کی دلداری میں مصروف رہی۔ سوسنا بڑی گھاگ عورت تھی۔ اس نے موہنی سے کچھ پوچھنے کی ضرورت نہ سمجھی۔ پونت رائے گو خاموشی سے دکان پر بل کاٹتا رہتا تھا لیکن دیکھتا سب کچھ تھا۔ اس نے درشن کے بارے میں سب کچھ مادام کو بتا دیا تھا اور مادام اس وقت موہنی پر واری جا رہی تھی۔

"کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے موہنی۔ میں سب کچھ سمجھتی ہوں۔ مگر میری عزیز بچی! یہ تمہاری زندگی کا پہلا غم ہے۔ اسے تو کسی نہ کسی طرح کھا لینا چاہیئے۔ اس غم کی بنیاد پر تم اپنی زندگی کی مسرت تعمیر کر سکو گی۔ تمہیں میری بات سن کر اچنبھا ہو گا۔ مگر یہ بالکل سچ ہے۔ اس دل کو چرکا کھانے دو۔ کیونکہ تمہارے مسائل بہت بڑے اور اُلجھے ہوئے ہیں۔ تمہارے بھائی! تمہاری ماں! شادی تو آخر ہر عورت کو کرنی ہے مگر سوچ سمجھ کر دل کے ہاتھوں لٹ کر نہیں، دل پر قابو پا کر، پانچ چھ سال یہاں کام کرو گی تو کچھ روپیہ بچا لو گی۔ پھر دھیرے دھیرے تمہاری بڑھتی ہوئی شہرت ایک دریا خوشبو کی طرح ہائی سوسائٹی میں پھیل جائے گی۔ اور تمہیں ایک دن ایک ایسا شوہر مل جائے گا جو مالدار بھی ہو اور تمہاری پسند کا بھی۔ یہ دونوں چیزیں زندگی کے لئے انتہائی ضروری ہیں۔ میری ڈارلنگ!

اس لئے اس غم کو سہہ لو۔ اس دنیا میں سچی مسرت غم کی بنیاد پر کھڑی ہوتی ہے جس طرح سے ہر اچھی خوشبو کے لئے یہ ضروری ہے کہ اس میں تھوڑی سی بدبو کے اجزا بھی شامل ہوں۔ شاید تمہیں معلوم نہیں ہے۔ میری بھولی بچی! کہ ہمارے فرانسیسی عطر ساز سو طرح کی خوشبوؤں کو ملا کر ایک خوشبو تیار کرتے ہیں۔ مگر ہر خوشبو کی بنیاد میں کسی نہ کسی بدبو کے اجزا بھی شامل رہتے ہیں۔ اسی بدبو کی بنیاد پر عطر

کی خوشبو پھیلی ہے۔۔۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔

موہنی نے آرام کرسی پر بیٹھے لیٹے سوچا۔ کیسا یہ زندگی کا اصول ہے۔۔۔ محبت کا غم کھاؤ اور دولت کا انتظار کرو۔ بھائیوں کو پالو اور جوانی کو کھو دو۔ طرح طرح کی خوشبوؤں کو حسن کی خشوہ طرازیوں میں لپیٹ کر لوگوں تک پہنچا دو، لیکن اگر تمہارے نتھنوں میں کہیں سے محبت کی اُڑی اُڑی سی خوشبو بھی آجائے تو فوراً منہ پھیر لو۔ کیونکہ اس سے کسی کی تجوری پر زد پڑتی ہے۔۔۔ اور یکایک موہنی کی سمجھ میں آگیا کہ فورٹ کے علاقے کی جتنی خوشبوئیں ہیں، ان سب کی بنیاد ناگپاڑے کی بدبو پر ہے۔ مگر جب یہ بات اس کی سمجھ میں آئی وہ چرکہ کھا چکی تھی۔ اس کی مسرت لٹ چکی تھی۔ درشن جا چکا تھا۔

مادام نے اسے گلے سے لگاتے ہوئے کہا۔ "میں اگلے ماہ سے تمہاری تنخواہ سے پچاس روپے کا اضافہ کر رہی ہوں۔"

شام کو وہ گھر پہنچ گئی۔ اس کی ماں آتنے دنوں سے اسے رام راج دکھانے پر اصرار کر رہی تھی۔ موہنی نے اپنے دونوں بھائیوں کے ساتھ ماں کو سینما دیکھنے کے لئے روانہ کر دیا۔ انہیں آنے جانے کے لئے ٹیکسی کے پیسے بھی دے دیئے۔ وہ آج شام چند گھنٹوں کے لئے بالکل اکیلی رہنا چاہتی تھی۔

جب اس کے بھائی اور ماں چلے گئے۔ تو اس نے اپنے بستر کو ٹھیک کیا۔ بستر کے قریب کی کھڑکی کھول دی۔ پرس کھول کر اس میں جائے (JOY) عطر کی شیشی نکالی جو وہ درشن کی دُلہن کو تحفہ میں دینا چاہتی تھی۔ پھر اس نے ایک خط اپنی ماں کو لکھا۔ ایک درشن کو اس کے آفس کے پتہ پر۔ پھر اس نے سیلپنگ پلز کی ساری گولیاں اپنی ہتھیلی پر انڈیل لیں، اور انہیں کھا کر بستر پر دراز ہو گئی۔

کھڑکی سے باہر میلی میلی چھتوں سے پرے آسمان تاریک ہوتا جا رہا تھا۔ دھیرے دھیرے پردوں کو ہلانے والی ہوا، پیاز، ہلدی اور کڑوے تیل کی بدبو سے لبریز ہوتی جا رہی تھی۔ بچے چلا رہے تھے، مائیں پیٹ رہی تھیں۔ موہنی نے اپنا چہرہ اپنے ناخنوں سے نوچ لیا تھا۔۔۔

جب آنکھیں نیند سے بوجھل ہونے لگیں اور کمرے کی ہر شے اسے اپنے گرد گھومتے دکھائی دینے لگی، تو اسے کچھ یاد آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا ہاتھ اپنے پرس کی طرف بڑھایا اور اس میں سے ٹٹول کر سٹونی ہارٹ کی شیشی نکال لی۔ وہ اسے اپنے بستر پر چھڑکنا چاہتی تھی۔ مگر اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی۔ سٹونی ہارٹ کی شیشی اس کے ہاتھوں سے چھوٹ کر فرش پر جا گری۔ اور عطر دھیرے دھیرے فرش پر بہنے لگا۔۔۔۔

دوسرے لمحہ میں پرس بھی موہنی کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔

گاڑی جانے میں ابھی ایک گھنٹہ باقی تھا۔ اور فلاری ڈمی سوزا اپنی آنکھوں کے آنسو پونچھ کر درشن سے کہہ رہی تھی۔ "سٹی فول۔ تم نے اپنی محبت کا اظہار تو اس سے کیا ہوتا؟"

"اس کی ضرورت نہ تھی۔" درشن اداسی سے بولا۔ "وہ سب جانتی تھی۔ اس نے مجھے ٹھکرا دیا۔"

"کیسے تم یہ کہہ سکتے ہو؟" فلاری ذرا غصے سے بولی۔ "کیا تم نے اس سے شادی کی درخواست کی تھی؟"

"نہیں! مگر کیا وہ اتنا بھی نہیں سمجھ سکتی تھی؟" درشن نے چڑ کر کہا۔

فلاری انتہائی غصے سے بولی۔ "تم نے اس سے پوچھا تو ہوتا۔ اس سے کہا تو ہوتا۔ اس کا انکار تو سنا ہوتا۔ لوگ تو پانچ پانچ برس تک عورت سے انکار سنتے ہیں۔ آخر میں اس سے ہاں کرا لیتے ہیں۔"

"کوئی فائدہ نہ ہوتا فلاری!" درشن کندھے جھٹکا کر بولا۔ "وہ امیر تھی میں غریب تھا۔ وہ وارڈن روڈ پر رہتی تھی۔ اپنی گاڑی میں بیٹھ کر دکان پر آتی تھی۔ ہزاروں روپے کا گاؤن پہنتی تھی۔۔۔۔"

"اوہ جاہل! جاہل!!" فلاری چلائی۔ "تم نے سب چوپٹ کر دیا۔ ارے بے وقوف وہ تو میری طرح غریب لڑکی ہے۔ مادام کی گاڑی میں آتی تھی اور مادام کی گاڑی میں جاتی تھی۔ گون اس کے اپنے نہ تھے دکان کے تھے۔ وہ وارڈن روڈ پر نہیں رہتی تھی، ناگپاڑے میں رہتی ہے، ایک معمولی کھولی میں۔ اس کا اڈریس مجھے معلوم ہے۔"

"تمہیں کیسے معلوم ہے؟"

فلاری نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔ "جس دن سے تم نے مجھے سینما لے جانا بند کر دیا۔ میری طرف پیار سے دیکھنا بند کر دیا۔ کیا میں اتنا بھی معلوم نہ کرتی! گدھے! گدھے!!"

فلاری نے اپنا پرس کھولا۔ اور اس میں سے ایک کاغذ کا پُرزہ نکال کر درشن کے ہاتھ میں دیکر کہا۔

"یہ اس کا پتہ ہے۔"

اس کے بعد فلاری روتے ہوئے وہاں سے بھاگ گئی۔

درشن تھوڑی دیر تک تو ہونچکا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر یکایک اسے کچھ یاد آیا۔ اس نے کاغذ کے پُرزے کو غور سے دیکھا۔ اپنا بیگ اٹھایا اور اسٹیشن کے باہر آکر ٹیکسی تلاش کرنے لگا۔

دروازے پر دستک ہوئی۔

"موہنی! موہنی!!"

دروازہ کسی نے نہ کھولا۔

"موہنی! موہنی!!۔۔۔ میں آگیا ہوں۔ میں درشن ہوں، میں تیرا درشن! موہنی دروازہ کھولو! میری موہنی!!"

مگر کسی نے دروازہ نہ کھولا۔

درشن نے ذرا سا زور لگایا۔ دروازہ خود بخود کھل گیا۔ درشن اندر چلا گیا۔

سامنے بستر پر موہنی مردہ پڑی تھی۔ تپائی پر دو خط تھے۔ ایک موہنی کی ماں کے نام، ایک درشن کے نام۔ ایک عطر کی شیشی تھی۔ (JOY) درشن کی دلہن کے لئے۔۔۔۔ ایک عطر کی شیشی فرش پر گر کر ٹوٹ چکی تھی۔۔۔ اور اس کی نحیف اداس خوشبو ساری فضا میں پھیل رہی تھی۔

"موہنی!" درشن نے رندھے ہوئے گلے سے کہا۔ "میرا انتظار تو کیا ہوتا پگلی!"

تھوڑی دیر تک وہ چپ چاپ ساکت کھڑا رہا۔

پھر یکایک وہ بستر پر گر گیا۔ اس نے موہنی کے دونوں پاؤں اپنے ماتھے سے لگا لئے۔ پھر اپنے۔۔۔ ہونٹوں سے لگا لئے۔ پھر بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔۔۔ اوہ۔۔ اوہ۔۔۔ سٹونی ہارٹ!!

عالمی سیاست

افغانستان کی مرکزی کمیٹی اختلافات کا شکار ہو گئی !!

سردار داؤد پختونستان اسٹنٹ کی حمایت کیوں کر رہے ہیں!

جمہوریت، آزادئ اظہار، خوشحالی، اعلیٰ معیارِ زندگی اور روزگار کے خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکے۔ افغان عوام نے فوجی انقلاب سے جو توقعات وابستہ کی تھیں، وہ پوری ہوتی نظر نہیں آتیں۔ سردار داؤد نے برسرِ اقتدار آتے ہی جمہوری راج نافذ کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن ابھی تک انہوں نے جمہوریت کی سمت پہلا قدم بھی نہیں اٹھایا۔ انتخاب کرانے کا نہ تو اعلان کیا اور نہ ہی کوئی تاریخ مقرر کی گئی۔ اخبارات پر سرکاری کنٹرول بدستور قائم ہے۔ وہ عوام کو ذاتی مفادات ختم کر دینے اور قوم کیلئے کام کرنے کا مشورہ دیتے ہیں۔ ہفت روزہ اکنامسٹ (لندن) کے مطابق افغانستان کے اخبارات کا انداز لیبیا اور عراق کے اخبارات جیسا ہے۔ افغان عوام کی اقتصادی صورتِ حال بہتر ہونے کے امکانات کم ہی نظر آتے ہیں کیونکہ گزشتہ دس برسوں میں پیداوار میں اضافے کی شرح، آبادی میں سالانہ ۳ء۲ فیصد اضافہ سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی۔ روزنامہ ہندوستان ٹائمز نئی دہلی کے مطابق افغانستان میں بادشاہت کے خاتمہ کا اظہار صرف محلوں پر متعین ٹینکوں اور فوجیوں سے ہوتا ہے۔ یا سردار عبدالولی خان کے محل کے ایک حصے سے جو انقلاب کے دوران توپ کے گولے سے اُڑا دیا گیا ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا گیا۔ ورنہ ملک کی سیاسی اور معاشی صورتِ حال میں کوئی فرق نہیں پڑا۔

روزنامہ ہندوستان ٹائمز کے مطابق سردار داؤد، ملٹری کے درمیانے اور جونیئر افسروں کی مدد سے انقلاب لائے ان افسروں میں سردار داؤد کا اثر و رسوخ اس لئے زیادہ تھا کہ انہوں نے سردار داؤد کی نگرانی میں فوجی تربیت حاصل کی تھی. یاد رہے کہ سردار داؤد ملٹری اکادمی کے سربراہ رہ چکے ہیں۔ اس کے علاوہ جونیئر افسر شاہ ظاہر شاہ سے ناخوش تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ ترقیاں صلاحیت اور اہلیت کی بنیاد پر نہیں دی جاتیں۔ بلکہ شاہی خاندان سے تعلقات اور سفارش کی بنیاد پر ترقیاں دی جاتی تھیں چنانچہ سردار داؤد نے ان حالات سے پورا پورا فائدہ اٹھایا اور بادشاہت کا تختہ اُلٹ دیا۔ افغان فوج کے کمانڈر انچیف جنرل غلام فاروق کو برطرف کر کے اپنے اعتمادی جنرل عبدالکریم کو کمانڈر انچیف بنا دیا۔

نئی حکومت کی طاقت کا سرچشمہ ایک مرکزی کمیٹی ہے۔ جس کے سربراہ خود سردار داؤد ہیں۔ اس کمیٹی کے اراکین کے نام خفیہ رکھے گئے ہیں۔ کوئی نہیں جانتا کہ ان میں کون شامل ہیں۔ البتہ خیال کیا جاتا ہے کہ یہ کمیٹی گیارہ سے چھبیس ارکان پر مشتمل ہے جن میں اکثریت نوجوان فوجی افسروں کی ہے۔ باخبر حلقوں کے مطابق سردار داؤد اور مرکزی کمیٹی کے درمیان اختلافات بڑھتے جا رہے ہیں کیونکہ مرکزی کمیٹی کی اکثریت ان نوجوان فوجی افسروں پر مشتمل ہے، جو سوویت یونین کے تربیت یافتہ ہیں۔ مرکزی کمیٹی دو حصوں میں بٹ گئی ہے۔ ایک طرف ۶۵ سالہ سردار داؤد اور ان کے ہم عمر مشیر ہیں۔ دوسری طرف نوجوان فوجی افسر ہیں۔ عمر اور تربیت کے فرق کی وجہ سے دونوں میں سیاسی اور نظریاتی اختلافات پائے جاتے ہیں۔ ابھی اختلافات کی خلیج اتنی وسیع نہیں ہوئی۔ لیکن امکان ہے کہ یہ اختلافات جلد ہی منظرِ عام پر آجائیں گے۔

ان ہی اختلافات کے سبب ابھی تک کسی متفقہ سیاسی اور اقتصادی پروگرام کا اعلان نہیں کیا جا سکا۔ سردار داؤد کو اپنی کابینہ کے لئے وزراء نامزد کرتے ہوئے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ اور کابل میں ایک عام خیال یہ ہے کہ یہ وزیر جن کو بہت کم لوگ جانتے ہیں، محض اس وقت تک کے لئے ہیں جب تک کہ سردار داؤد اپنی پوزیشن مستحکم نہیں کر لیتے۔

سردار داؤد اب بھی پختونستان کے اسٹنٹ کا بھرپور پروپیگنڈہ کر رہی ہے لیکن ابھی تک یہ بات واضح نہیں ہو سکی کہ پختونستان کی حمایت کر کے آخر سردار داؤد کیا چاہتے ہیں۔ ہفت روزہ اکنامسٹ (لندن) بھی سوال کرتا ہے کہ کیا سردار داؤد چاہتے ہیں کہ پٹھان قبائل پاکستان پر حملہ کر دیں یا اسلحہ اسمگل کرنے لگیں؟ ہمارے خیال میں سردار داؤد کو جن بھانت بھانت کے مسائل کا سامنا ہے ان کو حل کرنا ناممکن ہے۔ اس لئے وہ پختونستان کی حمایت کر کے افغان عوام کی توجہ ایک نام نہاد مسئلہ کی طرف مبذول کرانا چاہتے ہیں۔ اور ان کی کوشش ہے کہ عوام کو اس مسئلہ میں اتنا اُلجھا دیا جائے کہ وہ اپنے مسائل کو بھول جائے اور انہیں اپنا اقتدار مستحکم کرنے کے لئے وقت مل جائے۔ ■



سردار داؤد

امریکی عوام واٹر گیٹ اسکینڈل سے بور ہوگئے

صدر نکسن واٹر گیٹ اسکنڈل سے باخبر تھے، رائے شماری کے نتائج

صدر نکسن نے ابھی حال ہی میں ٹی وی اور پریس کانفرنس کے ذریعے واٹر گیٹ اسکنڈل پر اظہارِ خیال کیا۔ امریکیوں کی اکثریت اس بات پر یقین رکھتی ہے کہ وہ واٹر گیٹ کے بارے میں عوام کو پوری حقیقت سے باخبر نہیں کر رہے ہیں۔ ایک حالیہ سروے کے مطابق تقریباً ۴۵ فیصد امریکی سمجھتے ہیں کہ صدر نکسن واٹر گیٹ اسکنڈل سے قبل از وقت باخبر تھے۔ اس سلسلے میں ان کا رویہ خاصہ مشکوک رہا ہے اور اس مسئلے پر ان کا موقف انتہائی کمزور دکھائی دیتا ہے۔ گو امریکی عوام اس بات پر یقین رکھتے ہیں کہ صدر نکسن نے دستور کی خلاف ورزی کر کے جمہوری روایات کو پامال کیا۔ پھر بھی وہ یہ نہیں چاہتے کہ صدر نکسن صدارت کا عہدہ چھوڑ دیں۔ اس موقف کی تین بنیادیں ہیں — (الف) لوگ نکسن سے زیادہ ان افراد پر الزام دھرتے ہیں جو درحقیقت اس اسکنڈل کو جنم دینے والے ہیں۔ (ب) لوگ ذہنی طور پر صدر نکسن کی جگہ نائب صدر اسپار یو ایگینو کو صدر کی حیثیت سے قبول کرنے پر تیار نہیں ہیں۔ (ج) صدر نکسن کے مستعفی ہونے کی صورت میں اندرونی اور بیرونی طور پر جو مسائل اٹھ کھڑے ہوں گے ان سے لوگ خائف ہیں۔

امریکہ میں واٹر گیٹ اسکنڈل کے سلسلے میں جو سروے کیا گیا ہے اس کے بارے میں مذکورہ بالا ٹھوس حقائق سامنے آتے ہیں۔

امریکیوں کی عام رائے یہ ہے کہ صدر نکسن کی ذات واٹر گیٹ اسکنڈل میں ملوث ہے۔ لیکن ملک کو نقصان پہنچائے بغیر صدر نکسن کے خلاف کوئی عملی کارروائی کی گنجائش نظر نہیں آتی۔ اس لئے تقریباً ۴۵ فیصد لوگوں نے یہ جواب دیا کہ وہ اس اسکنڈل سے بوریت محسوس کرنے لگے ہیں۔

ہفت روزہ ٹائمز نے انکشاف کیا ہے کہ تقریباً ۴۵ فیصد لوگ اس بات سے متفق ہیں کہ صدر نکسن واٹر گیٹ اسکنڈل کے بارے میں قبل از وقت باخبر تھے۔ جبکہ ۳۹ فیصد لوگ اسے غلط سمجھتے ہیں — اس سوال پر کہ کیا صدر نکسن نے اس اسکنڈل کو چھپانے میں حصہ لیا۔ تقریباً ۶۰ فیصد لوگوں نے اثبات میں جواب دیا۔ اور ۲۶ فیصد لوگوں نے نفی میں جواب دیا۔ اسی طرح ۶۳ فیصد لوگوں نے اپنی رائے دیتے ہوئے کہا کہ وہ واٹر گیٹ اسکنڈل کے بارے میں صدر نکسن کے موقف سے مطمئن نہیں ہیں جبکہ ۲۵ فیصد کا جواب نفی میں ہے۔

سوال: کیا صدر نکسن واٹر گیٹ اسکینڈل کے بارے میں قبل از وقت علم رکھتے تھے؟

ہاں	نہیں
۴۵ فیصد	۳۹ فیصد

غیر یقینی ۱۶ فیصد

سوال: کیا صدر نکسن نے واٹر گیٹ اسکینڈل کو پوشیدہ رکھنے میں حصہ لیا؟

ہاں	نہیں
۶۰ فیصد	۲۶ فیصد

غیر یقینی ۱۳ فیصد

سوال: کیا آپ واٹر گیٹ کے مسئلے پر صدر نکسن کے جواب سے مطمئن ہیں؟

ہاں	نہیں
۶۳ فیصد	۲۵ فیصد

غیر یقینی ۱۲ فیصد

وفاقی جمہوریہ جرمنی

پارلیمنٹ کے رکن نے پچاس ہزار مارک میں اپنا ووٹ فروخت کر دیا

ارکانِ اسمبلی کے ووٹوں اور ضمیر کی خرید و فروخت صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہوتی، مغربی جمہوری ممالک میں بھی پارلیمان کے ارکان اپنے ووٹ فروخت کرتے ہیں، اور تجوریاں بھرتے ہیں۔ یہ بات الگ ہے کہ ہمارے ملک میں ایسے واقعات روایت بن چکے ہیں۔ ان واقعات پر عوامی ردِ عمل نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس مغربی جمہوری ممالک میں ایسے واقعات شاذ و نادر ہی رونما ہوتے ہیں اور ان پر عوامی ردِ عمل بہت سخت ہوتا ہے۔

گزشتہ سال مغربی جرمنی کی ولی برانت حکومت مشرقی جرمنی، روس اور مشرقی یورپ سے تعلقات استوار کرنے کے سبب پارلیمان میں اکثریت سے محروم ہو گئی۔ حزبِ اختلاف نے حکومت کے خلاف تحریک عدمِ اعتماد پیش کی۔ اس تحریک کے منظور ہونے کے قوی امکانات تھے۔ لیکن جب ووٹ ڈالے گئے اور ان کی گنتی ہوئی تو حکومت دو ووٹوں سے جیت گئی۔ کہا جاتا ہے کہ ان دو ووٹوں میں ایک ووٹ مسٹر جولیس شٹائنر کا تھا۔ ان کا تعلق حزبِ اختلاف کی پارٹی کرسچین ڈیموکریٹ پارٹی سے تھا۔ لیکن دوسرا شخص جس نے اپنی پارٹی کے خلاف ووٹ دیا تھا ابھی تک شناخت نہیں ہو سکا۔

اخبارات کا کہنا ہے کہ جولیس شٹائنر نے کسی اصول کے

باقی صفحہ ۳۱ پر



دھلی سمجھوتہ کے تحت حکومت پاکستان بہاریوں کو بلوانے پر رضامند ہو گئی ہے۔ اب بہاریوں کی آبادکاری کا مسئلہ درپیش ہو گا لہذا قارئین "الفتح" ان کی آبادکاری کے سلسلے میں اپنی تجاویز تحریر کریں (ادارہ)

ادارے کا اس سے متفق ہونا ضروری نہیں، آپ بھی اس بحث میں حصّہ لے سکتے ہیں (ادارہ)

1947 کا جذبہ پیدا کیجئے

● غلام مجتبیٰ عہدی ●

میں نے "الفتح" کے ۳۰ اگست کے شمارے میں غلام حسین قاضی صاحب کا مراسلہ پڑھا جو انہوں نے "بہاری" (غیر بنگالیوں) کے خلاف لکھا ہے۔ اس مراسلے کو پڑھنے کے بعد یہی معلوم ہوا کہ مراسلہ نگار "غلام حسین" ملک پرست نہیں قوم پرست ہیں، ملکی سوچ نہیں رکھتے بلکہ الگ قومیت کے طور پر سوچتے ہیں، اور انہیں پاکستان سے کوئی ہمدردی نہیں۔ انہیں صرف اپنی قوم (سندھی) سے محبت ہے اور وہ جو کچھ بھی سوچتے ہیں ایک سندھی کی حیثیت سے سوچتے ہیں اور انہیں پاکستان کی تاریخ کا کوئی علم نہیں۔

وہ لکھتے ہیں کہ "بہاری نہیں چاہئیں"۔ وہ بہاری سے مفہوم بہار کے رہنے والوں سے لے رہے ہیں اور اس کو ثابت کرنے کے لئے وہ کہتے ہیں کہ ہم ۲۶ برس سے لفظ بہاری سنتے آ رہے ہیں جبکہ یہ بالکل غلط ہے۔ وہ آج سے ۲۶ برس پہلے شاید پیدا بھی نہ ہوئے ہوں۔ بنگالیوں نے لفظ بہاری نومبر ۱۹۶۹ء سے ان تمام لوگوں کے لئے استعمال کرنا شروع کیا جو کہ اردو بولتے تھے یا ان کا اردو سے کسی قسم کا تھوڑا سا بھی لگاؤ تھا اس میں بہار کے لوگ، یو پی، سی پی، پنجاب، سندھ، سرحد، بلوچستان ہر جگہ کے لوگ شامل تھے۔ آپ یہ لکھتے ہیں کہ بنگلہ دیش بن جانے کے بعد بہاری بھی بنگلہ دیش کے شہری بن گئے۔ یہ صرف ان کی سوچ ہے جبکہ بہاری جن کو میں غیر بنگالی کہوں گا انہوں نے بنگلہ دیش بننے کی مخالفت کی اور قاضی صاحب کو یہ بھی بتا چلوں کہ اگر غیر بنگالی پاک فوج کا ساتھ نہ دیتے تو جس وقت پاک فوج نے کارروائی کی، کامیاب نہ ہو سکتی اور غیر بنگالیوں نے جو فوج کا ساتھ دیا، وہ صرف ایک پاکستانی کے جذبے سے اور جب وہ فوج کے حامی تھے تو پھر ان کے شہری ہو جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اگر یہ بات ہے تو ہمارے ۹۰ ہزار جنگی قیدی جو کہ بنگلہ دیش میں قید ہوئے وہ بھی وہاں کے شہری ہیں اور انہیں بھی پاکستان آنے کا کوئی حق نہیں مگر آپ ان کی حمایت اس لئے کریں گے کہ اس میں آپ کے سندھی بھی شامل ہیں۔ اور جو مہاجر یہاں آئیں گے وہ اسلام کی بنیاد پر نہیں بلکہ پاکستانی ہونے کی وجہ سے۔ جہاں تک غیر بنگالیوں کے جماعت اسلامی کی حمایت کرنے کا تعلق ہے تو مہاجروں کی یہ سیاسی غلطی تھی، جو کہ انہوں نے مشرقی پاکستان میں جماعت اسلامی کی حمایت کی تھی اور انہیں اب اپنی غلطی کا احساس ہے اور اب وہ ایسا نہیں کریں گے۔

جہاں تک مہاجروں کو یحییٰ کے حامی کہنے کا تعلق ہے تو مہاجروں نے یحییٰ خان کی حمایت نہیں کی تھی بلکہ انہوں نے پاکستان کی حمایت کی تھی۔ انہوں نے جو کچھ بھی کیا وہ پاکستان کیلئے کیا۔ اور اب بھی ان پر جو مظالم ڈھائے جا رہے ہیں وہ صرف اس لئے کہ وہ پاکستان کے حامی ہیں۔ ہاں بنگالیوں کا ناجائز خون ہوا وہ ان مہاجروں اور بنگالیوں نے کیا جو جماعت اسلامی کے تنخواہ دار تھے۔ انہوں نے اپنی سیاسی دشمنی میں یہ کام کیا اور ہر اس شخص کو تکلیف پہنچائی جو کہ جماعت اسلامی کا مخالف تھا۔ خواہ وہ مہاجر تھا یا بنگالی۔ اگر وہاں رہنے پر ہی اس کی شہریت کا تعلق ہے تو پھر ۱۹۴۷ء میں جب پاکستان بنا اور لوگ ان علاقوں سے کثیر تعداد میں آئے جو کہ ہندوستان کے علاقے کے تھے، کیا ان کا حق نہیں تھا؟ ان کا حق تھا، وہ اسی بنیاد پر آئے۔ کچھ مغربی پاکستان آئے، کچھ مشرقی پاکستان گئے۔ جہاں بھی گئے پاکستان میں ہی گئے۔ اور آج جبکہ مشرقی پاکستان نہ رہا تو پھر وہ مغربی پاکستان آنا چاہتے ہیں۔ اور اس کا انہیں حق ہے۔ ایک پاکستان کی بنیاد پر لکھتے ہوئے کہتے ہیں کہ اگر چین، ایران یا روس کے لوگ پاکستان کے حامی ہو جائیں تو کیا انہیں بھی ہم قبول کر لیں گے۔ یہ مثال دیتے ہوئے غلام حسین صاحب نے یہ نہیں سوچا کہ یہ لوگ جو پاکستان سے محبت کر رہے ہیں وہ ۲۵ سال سے کر رہے ہیں۔ اور یہ محبت ہی تھی جو کہ وہ ہندوستان سے پاکستان کے نام پر مشرقی پاکستان گئے۔

باقی صفحہ ۳۱ پر

بنگالیوں نے لفظ "بہاری" کا استعمال نومبر ۶۹ء سے شروع کیا

۱۹۷۱ء میں چار کروڑ اسّی لاکھ مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصّہ لیا

بین الاقوامی مزدور تحریک کے "نئے" رجحانات

شاہد حسین



سرمایہ دار دنیا مزدور طبقے کے طاقتور ریلے سے لرزہ براندام ہے۔ تمام تر لیپا پوتی کے باوجود استحصالی نظام کی عمارت چٹخ رہی ہے اور اس کی دیواریں زمین بوس ہو رہی ہیں۔ مزدور طبقے کے سیاسی شعور اور اس کی تنظیمی قوت کا اندازہ اس امر سے لگایا جا سکتا ہے کہ صرف ۱۹۷۱ء میں چار کروڑ اسّی لاکھ مزدوروں نے ہڑتالوں میں حصّہ لیا۔ ہڑتالیں دراصل مالکان سے "بات چیت" کو مؤثر بنانے کا ایک طریقہ ہیں، اور مزدور طبقے کی جدوجہد کو آگے بڑھانے میں اہم کردار ادا کرتی ہیں۔ چند گھنٹوں کی ہڑتال بھی سرمایہ دار کو ناقابلِ تلافی نقصان پہنچاتی ہے اور اسے مزدوروں کے مطالبات تسلیم کرنے پر مجبور کر سکتی ہے۔

مزدور طبقے کی یہ کامیابی اس کی بے پناہ تنظیمی قوت کی آئینہ دار ہے۔ تاہم اس جدوجہد کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ اس میں طبقاتی تضادات پورے طور پر نہیں ابھر پاتے اور لڑائی بڑی حد تک "پُرامن" ہو جاتی ہے۔ مزدوروں کو "امن" کا یہ راستہ دکھانے میں سرمایہ داروں کا بھی خاصا دخل ہے، جن کی کوشش ہوتی ہے کہ مزدوروں کی جدوجہد "خطرناک" رُخ اختیار کرنے سے پہلے ہی گفت و شنید کے ذریعے ختم کر دی جائے۔ اس معاملے میں اصلاح پسند ٹریڈ یونین لیڈر سرمایہ داروں سے بھرپور تعاون کرتے ہیں۔

گزشتہ چھ، سات برسوں میں مزدور تحریک خاصی تیز رفتاری سے آگے بڑھی ہے۔ فرانس، اٹلی، برطانیہ اور دوسرے ملکوں میں جو ہڑتالیں ہوتیں اُن کی اہمیت کی وجہ صرف یہ نہیں کہ وہ طویل عرصے تک جاری رہیں بلکہ اس وجہ سے بھی قابلِ توجہ ہیں کہ مزدوروں نے معاشی بہتری کے علاوہ ریاستی پالیسی میں بھی تبدیلی کا مطالبہ کیا۔ دوسرا اہم پہلو یہ ہے کہ کم اُجرت پانے والے اور بیروزگار مزدوروں کے علاوہ اُن مزدوروں نے بھی اس میں بھرپور حصّہ لیا ہے۔ جن کا معیارِ زندگی نسبتاً بہتر تھا اور جو کم ہی میدانِ عمل میں نکلتے تھے۔

سرمایہ دار ملکوں میں مزدور طبقے کی بڑھتی ہوئی قوت اور انقلابی جدوجہد میں کامیابیوں میں سرمایہ دارانہ نظام کے ڈھانچے میں ہونے والی تبدیلیوں کا بھی خاصا دخل ہے۔ نئے حالات میں محنت کش عوام کے نئے حلقے سیاسی جدوجہد کی راہ اپنا رہے ہیں، اور اپنے آپ کو سیاسی شعور سے مسلح کر رہے ہیں۔ لہٰذا ایک وسیع تر اجارہ دار دشمن محاذ کا قیام عمل میں آ رہا ہے۔ مشینوں کے بے پناہ استعمال نے دفتری ملازمین اور صنعتی مزدوروں کے درمیان فاصلے کو گھٹا دیا ہے۔ اور دونوں کے سماجی و معاشی حالات میں کچھ زیادہ فرق نہیں رہا ہے۔

ابھی تک سرکاری ملازمین جن کا شمار "سفید پوش" طبقے میں ہوتا ہے، طبقاتی جدوجہد سے دور تھے اور حکومت کے حاشیہ بردار کا کردار ادا کرتے تھے۔ لیکن حالیہ برسوں میں اُن کے درمیان بھی سیاسی شعور کی روشنی پہنچی ہے اور وہ جدوجہد پر کمربستہ نظر آتے ہیں۔ اٹلی، فرانس، جاپان اور امریکہ کے "سفید پوش" ملازمین اپنے مطالبات کے حصول کے لئے سڑکوں پر نکل آئے۔ مئی ۷۲ء میں جاپان کی وزارتوں اور میونسپل اداروں کے بارہ لاکھ ملازمین نے اپنے مطالبات کے حق میں زبردست مظاہرہ کیا حالانکہ یہ جاپانی قانون کی صریحاً خلاف ورزی تھی۔ اسی طرح ۱۱ جنوری ۱۹۷۳ء کو برطانیہ کے تین لاکھ سرکاری ملازمین ہڑتال پر چلے گئے۔ موجودہ ٹوری حکومت نے اُجرتوں کو "منجمد" کرنے کی جو پالیسی ترتیب دی۔ اس کے نتیجے میں روزمرہ استعمال کی اشیاء کی قیمتیں آسمان سے باتیں کرنے لگیں جبکہ اُجرتوں میں کوئی اضافہ نہیں ہوا۔ یہ صورتِ حال ملازمین کے لئے تشویشناک تھی جس نے انہیں علمِ بغاوت لیکر چلنے پر مجبور کر دیا۔

سرمایہ دار دنیا میں اجارہ دار سیاسی گٹھ جوڑ کے خلاف جب مزدور طبقہ آواز بلند کرتا ہے تو اس کی معاشی جدوجہد بھی سیاسی رنگ اختیار کر لیتی ہے۔ بلاشبہ یہ بین الاقوامی مزدور تحریک کی اہم کامیابی ہے۔ مزدوروں میں شدت سے یہ احساس پیدا ہو چلا ہے کہ ان کی نجات اپنی فیکٹری کی حالت سدھارنے تک محدود نہیں بلکہ تمام مزدور طبقے کے اتحاد اور ان کے متحدہ عمل میں مضمر ہے۔ مزدوروں کی ملک گیر ہڑتالیں اور جلسے جلوس ان کی اس خواہش کا واضح اظہار ہیں کہ وہ چند مراعات کے لئے جدوجہد نہیں کر رہے بلکہ ان کی لڑائی پورے استحصالی نظام کے خلاف ہے۔

بین الاقوامی مزدور تحریک کے نئے رجحانات کا مطالعہ کرنے کے لئے ضروری ہے کہ سرمایہ داری کے سماجی و معاشی ڈھانچے کی تبدیلیوں اور پرولتاریہ کی تفصیلات کا مطالعہ کیا جائے۔ سائنسی اور تکنیکی انقلاب نے محنت کش طبقے کے مفہوم میں بڑی وسعت پیدا کر دی ہے۔ اب ترقی یافتہ سرمایہ دار ملکوں کے ۷۵ سے ۹۰ فیصد تک ملازمین محنت

کش کی تعریف میں آتے ہیں اور پچھلے دس پندرہ سالوں میں ذہنی کام کرنے والے افراد کی تعداد میں بڑی تیزی سے بڑھی ہے۔ آج کے حالات میں دفتری ملازمین کو درمیانے طبقے میں شمار کرنا کچھ زیادہ صحیح نہ ہوگا کیونکہ مہنگائی اور دوسرے مسئلوں نے انہیں مزدور طبقے کے بہت قریب کر دیا ہے اور وہ مزدوروں سے زیادہ قدرِ زائد فراہم کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی خودکار اور جدید ترین مشینوں کے استعمال نے ایک نئی "پرولتاریہ" کو جنم دیا ہے جسے جسمانی اور ذہنی دونوں قسم کے کام کرنے ہوتے ہیں۔ مثال کے طور پر تکنیکی کام کرنے والے پڑھے لکھے افراد کو پیش کیا جا سکتا ہے لیکن اس سے یہ نتیجہ اخذ کرنا صحیح نہیں ہوگا کہ سرمایہ دارانہ نظام کے طبقاتی تضادات ختم ہو گئے ہیں یا پرولتاریہ کے انقلابی کردار میں کوئی تبدیلی آ گئی ہے۔ بلکہ غور سے دیکھا جائے تو صاف نظر آتا ہے کہ مزدور طبقے کے شعور اور اس کی جدوجہد اب ایک نئی شان سے ترقی کے مراحل طے کر رہی ہے اور روز بروز وسعت اختیار کرتی جا رہی ہے۔ مثال کے طور پر فرانس کی مئی جون ۶۸ء کی عظیم الشان ہڑتال میں ہزاروں نوجوان مزدور تنخواہوں میں اضافے کی بجائے "غلامی" سے نجات کو اہمیت دیتے تھے۔ یہ رجحان آج کے مزدور طبقے کی نفسیات کو سمجھنے میں بہت مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

بین الاقوامی مزدور تحریک کو سوشلسٹ ملکوں کی ترقی سے بھی بڑی تقویت ملی ہے۔ سائنس کو عوامی مفادات کے لئے استعمال کرنے کا خواب اب حقیقت کا روپ دھار رہا ہے، جسے دیکھ کر سرمایہ دار دنیا کے مظلوم طبقات ایک نئے جوش اور ولولہ کے ساتھ تحریک میں شامل ہو رہے ہیں۔

بین الاقوامی مزدور تحریک جوں جوں وسعت اختیار کر رہی ہے ویسے ہی محنت کش طبقے کی انقلابی تنظیموں کی ذمہ داریاں بھی بڑھتی جا رہی ہیں۔ مزدوروں کو سیاسی شعور سے مسلح کرنے اور بروقت اور صحیح سمت میں ان کی تحریک کو موڑنے کا کام کچھ اتنا زیادہ آسان نہیں ہے۔ لہٰذا انقلابی تنظیمیں اپنی نظریاتی تعلیم اور عملی جدوجہد پر پہلے سے کہیں زیادہ توجہ دے رہی ہیں۔ اور اجارہ داروں کے خلاف متحدہ محاذ بنانے میں مصروف ہیں۔

بقیہ ۰ سیلاب کی تباہ کاریاں

لاکھ روپے کے لگ بھگ ہے۔

متاثرہ ریلوے لائنوں کی مرمت کر کے انہیں معمول کے مطابق بنانے کے لئے ۶ کروڑ روپے کی ضرورت ہو گی۔ سیلاب میں غلہ بہہ جانے کی وجہ سے ملک کو فوری طور پر ۲۰ لاکھ ٹن گندم اور ۵ لاکھ ٹن دیگر غلہ کی ضرورت پیش آئے گی، اور اگلی فصل کے لئے دو لاکھ ٹن گندم کے بیج درکار ہوں گے۔

بقیہ ۰ عالمی سیاست

تحت برانت حکومت کی حمایت نہیں کی بلکہ اس کا اصل سبب وہ پچاس ہزار مارک تھے جو اسے حکومت کے حق میں ووٹ ڈالنے کے عوض بطورِ رشوت دیئے گئے تھے۔ روزنامہ "دی ویلٹ" نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ "گزشتہ سال کی تحریک عدمِ اعتماد کی ناکامی کے کچھ دنوں میں جولیس شٹائنر نے دو مرسڈیز اور ایک مہنگی کوٹھی خریدیں"۔

اس الزام کی تحقیقات پارلیمان کی ایک کمیٹی کر رہی ہے، جو ۹ ارکان پر مشتمل ہے۔ جولیس شٹائنر نے کمیٹی کے سامنے رشوت لینے کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ "میں جولیس شٹائنر اپنی زندگی کا بدترین اعتراف کر رہا ہوں اور یہ تسلیم کرتا ہوں کہ یہ اسکنڈل وفاقی جمہوریہ جرمنی کی تاریخ میں ایک تاریک باب کی حیثیت کا حامل ہوگا"۔ شٹائنر نے یہ تسلیم کیا کہ اپریل ۱۹۷۲ء میں انہوں نے اپنا ووٹ ولی برانت کی حکومت کے حق میں فروخت کیا تھا۔ انہوں نے اس بات کا بھی انکشاف کیا کہ سوشل ڈیموکریٹ پارٹی کے کاروباری منیجر کارل وینانڈ نے انہیں ۵۰ ہزار مارک بطورِ رشوت دیئے تھے لیکن تحقیقاتی کمیٹی نے اتنے متضاد بیانات ریکارڈ کئے ہیں کہ اصل معاملہ کا پتہ نہیں چلتا۔ سراغ رسانی سروس کے رہنما کا کہنا ہے کہ اگرچہ اس سلسلے میں پوری تحقیقات کی جا رہی ہیں لیکن حقیقت کا علم جولیس شٹائنر کے علاوہ اور کسی فرد کو نہیں ہے۔

سیاسی حلقے ولی برانت حکومت پر بھی نکتہ چینی کر رہے ہیں کہ اس نے اپنی حکومت قائم رکھنے کیلئے حزبِ اختلاف کے ایک رکن کو رشوت کیوں دی؟ اخبارات، ریڈیو اور ٹیلی ویژن بھی حکومت کے اس اقدام کی مذمت کر رہے ہیں۔ حزبِ اختلاف یعنی کرسچین ڈیموکریٹ پارٹی اس مسئلہ کے تمام پہلوؤں کی چھان بین پر زور دے رہی ہے۔ اور اس کا مطالبہ ہے کہ یہ تحقیق کرائی جائے کہ آیا ولی برانت کے علم میں تھا کہ شٹائنر کو حکومت کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لئے رشوت دی جا رہی ہے۔ ولی برانت نے تحقیقات کا خیر مقدم کیا ہے اور کہا ہے کہ اگر ضرورت پڑی تو وہ تحقیقاتی کمیٹی کے سامنے بیان دیں گے۔ اگر تحقیقات کے دوران یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ولی برانت کو اس رشوت کا پہلے علم نہیں تھا تب بھی موجودہ حکومت کی ساکھ پر برا اثر پڑے گا کہ وہ اپنا اقتدار برقرار رکھنے کے لئے اوچھے حربے استعمال کرتی ہے۔

بقیہ ۰ اظہارِ خیال

جہاں تک اردو کی بنیاد پر مہاجروں کے آنے کا تعلق ہے تو یہ صرف قاضی صاحب ہی کہہ سکتے ہیں۔ مہاجر صرف اس بنیاد پر آئے گا کہ وہ پاکستانی ہے وہ کسی قومیت کی بنیاد پر آنا نہیں چاہتا۔ اور یہ جماعتیں جماعت اسلامی وغیرہ جو کہ مہاجروں کی حمایت کر رہی ہیں، ان کا مطلب یہ ہے کہ انہیں کچھ کہنا چاہیئے ورنہ انہیں مہاجروں سے کوئی ہمدردی نہیں۔ جماعت کے امیر مہاجروں کو "بھگوڑے" وغیرہ کے الفاظ سے ڈراتے ہیں تو مہاجر ان کی باتوں میں آنے سے رہے۔ ہاں مہاجروں نے غلطیاں کی ہیں۔ جن کا احساس انہیں اب ہو چکا ہے۔ اور وہ ہیں سیاسی غلطیاں۔ اب وہ سب لوگوں سے واقف ہو چکے ہیں۔ اور یہ کہنا کہ پاکستان میں ان کے لئے کوئی جگہ نہیں سراسر غلط ہے۔ ان کا پاکستان پر اسی طرح حق ہے جس طرح کہ ایک پنجابی، پٹھان، سرحدی، سندھی اور بلوچی کا ہے۔ وزیرِ اعظم جناب بھٹو صاحب بھی ان باتوں کو مانتے ہیں اور وہ تیار بھی ہو گئے ہیں اور انہی کی رضامندی کا نتیجہ ہے کہ آج لوگ آ رہے ہیں۔ تو غلام حسین قاضی صاحب آپ کا یہ کہنا بے بنیاد ہے۔ بلکہ آپ کے دل میں وہی جذبہ پیدا ہو جانا چاہیئے جو ۴۷ء میں تھا۔ اور جو لوگ آئیں گے انہیں بڑھ کر گلے لگانا چاہیئے۔

Regd No : S - 2772
Weekly "Al - Fatah" Karachi
13-20, SEPT 1973



پنجاب میں گاؤں کے گاؤں حالیہ سیلاب کی بے رحم لہروں کی نذر ہو گئے۔ لہلہاتی کھیتیاں پانی کی تیز و تند موجوں میں غرق ہو گئیں۔ بستیاں تباہ ہو گئیں اور بے شمار ہنستے مسکراتے ہوئے انسانی چہرے غروب ہو گئے۔ لیکن یہ بدنیت اور سنگدل لہریں انسانی عزم و حوصلے کو شکست نہ دے سکیں۔ طغیانی سے کھیلتے ہوئے حرکت اور حرارت کا یہ چھوٹا سا انسانی قافلہ ہمیشہ اسی طرح قدرت کے چیلنج کا منہ توڑ جواب دیتا رہے گا۔